سورۂ المدثر

۷۴۔ اَلْمُدَثِّرْ

نام سورہ کے آغاز میں نبی ﷺ کو ' اَلْمُدَثِّرْ ' (چادر اوڑھنے والے) کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام' اَلْمُدَثِّرْ ' ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ شروع کی آیتیں پہلے نازل ہوئیں اور بقیہ حصہ بعد میں نازل ہوا۔

مرکزی مضمون نبی ﷺ کو منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی ہدایت دینا۔ اور آپ کے اِنذار (خبردار کرنے) کے بعد بھی جو لوگ انکارِ حق پر مصر ہیں، انہیں جہنم کے دردناک عذاب کی وعید سنانا ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۱۰ میں نبی ﷺ کو خبردار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی ہدایت دیتے ہوئے فضیلتِ اخلاق اور بلندیٔ کردار کی تلقین کی گئی ہے۔

آیت ۱۱ تا ۳۱ میں قریش کے لیڈروں کو جو مخالفت پر آمادہ ہو گئے تھے، جہنم کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

آیت ۳۲ تا ۴۸ میں آخرت کے بارے میں فہمائش ہے۔

آیت ۴۹ تا ۵۶ میں قرآن کے یاددہانی ہونے کے پہلو کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ بات دل میں اتر جائے۔

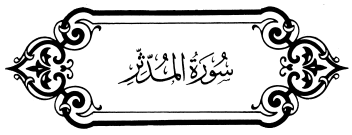

سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱
قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳
وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝۵
وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶
وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷
فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝۸
فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝۹
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝۱۰
ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝۱۱
وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝۱۲
وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝۱۳
وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝۱۴
ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝۱۵
كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝۱۶
سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝۱۷
اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝۱۸
فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۱۹
ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝۲۰
ثُمَّ نَظَرَ ۝۲۱
ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝۲۲

۷۴۔ سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّر

آیات:۵۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ اے چادراوڑھنے والے! ا؎
۲ اٹھواورخبردارکرو، ۲؎
۳ اوراپنے رب کی بڑائی بیان کرو، ۳؎
۴ اوراپنے کپڑے پاک رکھو، ۴؎
۵ اور(بتوں کی) گندگی سے دوررہو، ۵؎
۶ اورزیادہ حاصل کرنے کی غرض سے احسان نہ کرو، ۶؎
۷ اوراپنے رب کے لئے صبرکرو۔ ۷؎
۸ پھرجب صور پھونکا جائے گا، ۸؎
۹ تو وہ دن بڑا ہی سخت دن ہوگا،
۱۰ کافروں پرآسان نہ ہوگا۔ ۹؎
۱۱ چھوڑدو مجھے اوراس شخص کو، جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، ۱۰؎
۱۲ اوراس شخص کو کثیر مال بخشا، ۱۱؎
۱۳ اورحاضر رہنے والے بیٹے دئے، ۱۲؎
۱۴ اوراس کے لئے سامان مہیا کیا، ۱۳؎
۱۵ پھروہ توقع رکھتا ہے کہ میں اسے اورزیادہ دوں گا، ۱۴؎
۱۶ ہرگزنہیں۔ وہ ہماری آیتوں سے بیر رکھتا ہے۔ ۱۵؎
۱۷ میں اس کو عنقریب ایک کٹھن چڑھائی چڑھاؤں گا۔ ۱۶؎
۱۸ اس نے سوچا اورایک بات تجویز کی، ۱۷؎
۱۹ تو مارا جائے وہ، کیسی بات اس نے تجویز کی!
۲۰ پھر مارا جائے وہ، کیسی بات اس نے تجویز کی!
۲۱ پھر اس نے نظر ڈالی،
۲۲ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا،

۱۔ پہلی وحی جو نبی ﷺ پر آئی وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیتیں (اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی۔۔۔) تھیں۔اس کے بعد دوسری وحی سورۂ مدثر کی ابتدائی آیتوں کی صورت میں نازل ہوئی۔ چونکہ وحی کے نزول اور فرشتہ کے نظر آنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔اس لئے بہ تقاضائے بشریت آپ ﷺ پر ہیبت طاری ہوگئی، جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا ہے (ملاحظہ ہو بخاری کتاب التفسیر باب سورۃ المدثر)۔اس ہیبت کی وجہ سے آپ ﷺ نے چادر اوڑھ لی تھی۔اس موقع پر آپ کے طبعی خوف کو دور کرنے اور وحی سے مانوس کرنے کے لئے یاایھا المدثر (اے چادر اوڑھنے والے) کے پیار بھرے لفظ سے آپ کو مخاطب کیا گیا۔

واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام پر جب پہلی مرتبہ وحی آتی ہے، تو انہیں اس کے وحی الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہیں ہوتا۔ نبی ﷺ کو بھی کوئی تردد نہیں ہوا، البتہ فرشتہ کے پہلی مرتبہ نظر آنے سے بہ تقاضائے بشریت آپ ﷺ پر ہیبت طاری ہوئی جو ایک عارضی کیفیت تھی۔

اس موقع پر سورۂ مزمل نوٹ ۱۔ بھی پیشِ نظر رہے۔

۲۔ یہاں اٹھو کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ آرام کی نیند سو رہے ہیں اور اس سے اٹھ کھڑے ہو جائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ خدا اور آخرت سے غافل انسانوں کو خبردار کرنے کے لئے عزم و ہمت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں۔

اس آیت سے واضح ہوا کہ نبی ﷺ کو جو پہلی ہدایت دی گئی وہ انذار (خبردار کرنے) کی تھی۔ اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی یہ اہم ترین خصوصیت ہے کہ وہ لوگوں کو سب سے پہلے اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ تاکہ وہ چونک جائیں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ ان کی دعوت کا ارتکاز (Focus) افراد کا نفس ہوتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے بگاڑ کو دور کرنا اور صالح نظام قائم کرنا سب شریعت کے تقاضے ہیں۔ لیکن انبیائی طریق دعوت نے ہر چیز کا ایک محل متعین کر دیا ہے، اس لئے اس کو اسی محل پر رکھنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ توازن بگڑ جاتا ہے، جس کا مظاہرہ موجودہ دور میں دعوتی کام کے سلسلہ میں ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دعوتی کام کرنے والوں نے گھوڑے کے آگے گاڑی کو باندھ دیا ہے، اس لئے ان کی دعوت موثر ثابت نہیں ہوتی۔

اس موقع پر سورۂ نوح آیت ۱ نوٹ ۲ بھی پیشِ نظر رہے۔

۳۔ یعنی کبریائی صرف اللہ کے لئے ہے، اس لئے اسی کی کبریائی کا ذکر تمہاری زبان پر ہونا چاہئے اور اسی کا چرچہ لوگوں میں کرنا چاہئے۔ نماز کا آغاز تکبیر یعنی اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) کے کلمات ہی سے ہوتا ہے۔ اور اذان میں بھی بار بار اس کلمہ کو دہرایا جاتا ہے، تاکہ فضا اللہ کی تکبیر سے گونج اٹھے۔

تکبیر کا حکم سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں بھی دیا گیا ہے: وَ کَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا

''اور اس کی بڑائی بیان کرو جیسی بڑائی بیان کرنا چاہئے۔''

اللہ کی بڑائی بیان کرنے میں شرک کی تردید بھی ہے اور توحید کا اثبات بھی۔ مشرکین نے کسی کو مہادیو بنا دیا ہے اور کسی کو مہاتما، جن کی وہ پرستش کرتے ہیں، لیکن یہ صرف دعوے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کبریائی اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے اور نہ اس کے سوا کوئی معبود ہے، جس کی پرستش کی جائے۔

۴۔ ظاہر کی پاکیزگی سے باطن کی پاکیزگی کا احساس اُبھرتا ہے۔ اس لئے اسلام نے ظاہر کی پاکیزگی کو بڑی اہمیت دی ہے چنانچہ نماز کے لئے کپڑوں کا نجاست سے پاک ہونا ضروری ہے۔ اور جب کپڑوں کو پاک رکھنے کی ہدایت کی گئی تو جسم کو پاک رکھنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہوا۔

اسلام نے پیشاب اور دوسری نجاستوں سے طہارت حاصل کرنے اور کپڑوں کو پاک رکھنے کا بہترین طریقہ بتایا ہے۔ اور طہارت (پاکیزگی) کا

اہتمام نماز پڑھنے والوں کا اولین وصف ہے۔لیکن موجودہ دور کے کتنے ہی مہذب لوگ طہارت کے اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں۔

۵۔ رُجز کے معنی القاموس المحیط میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

القذر وعبادۃ الاوثان والعذاب والشرک

''گندگی، بتوں کی پرستش، عذاب اور شرک۔''

اور ہجر کے معنی دور رہنے کے بھی آتے ہیں (**ھجر الرجال ھجرا اذا تباعدو نأی**۔''یعنی لوگوں سے دور اور الگ رہے'' لسان العرب ج ۵ ص ۲۵۲)

یہاں خاص طور سے بتوں کی گندگی اور شرک سے دور رہنا مراد ہے۔ نبی ﷺ کیلئے اس حکم کی حیثیت ایک تاکیدی حکم کی تھی، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وَ لَاتُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا (کسی کو میرا شریک نہ ٹھہرانا۔سورۂ حج:۲۶) ورنہ نبی ﷺ زمانۂ جاہلیت میں بھی بت پرستی سے الگ رہے۔علاوہ ازیں یہ حکم اس معنی میں بھی تھا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ اللہ نے بت پرستی کو چھوڑ دینے اور اس سے علیٰحدہ رہنے کا حکم دیا ہے۔

۶۔ آدمی دوسرے پر احسان اس لئے کرتا ہے، تاکہ اس سے بدلہ میں زیادہ پائے یا اس کا کوئی نہ کوئی مفاد اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ پست اخلاقی کی بات ہے۔ بلند اخلاقی یہ ہے کہ آدمی بے لوث ہو کر احسان کرے۔ یہ ہدایت گونا گوں پہلوؤں سے ہے۔لیکن خاص طور سے یہاں فریضۂ رسالت کی ادائیگی اور اس سلسلہ میں لوگوں کی نصح وخیر خواہی کا پہلو نمایاں ہے، اور نبی ﷺ کی سیرت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچانے پر لوگوں سے کوئی اجر طلب نہیں کیا۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ (ص:۸۶)

''کہو میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کتنی عظیم ہے۔جس تعلیم کا آغاز اس بلند سطح سے ہوا ہو اس کا عروج اور اس کی انتہا کیا ہوگی! قرآن کا اعجاز (معجزہ ہونا) تو اس کی تعلیمات سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

۷۔ یعنی جب لوگوں کو خبردار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو تو قدم قدم پر صبر آزما حالات سے دوچار ہونا ہوگا۔لہٰذا تم صبر کو اپنا شیوہ بنالو۔اور یہ صبر خلوص دل سے اللہ کے لئے ہونا چاہئے۔ وہ اس کی بہترین جزا دے گا۔

۸۔ یعنی قیامت کا بگل بجے گا۔

۹۔ یعنی یہ دن کافروں کے حق میں نہایت سخت دن ہوگا۔ایسا سخت کہ کسی پہلو سے بھی آسانی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

۱۰۔ یعنی میں تنہا اس کا خالق ہوں اور اس سے نمٹنے کیلئے کافی ہوں۔اس ارشاد سے ایک طرف نبی ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ ﷺ ان لوگوں کی فکر نہ کریں جو آپ ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش ہیں۔اور دوسری طرف مخالفت کرنے والوں کو تنبیہ ہے کہ معاملہ اللہ سے ہے اور اس کی گرفت بڑی سخت ہے۔

۱۱۔ یعنی دولت مند بنایا۔

۱۲۔ یعنی ایسے بیٹے جو اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹائیں اور اس کی خدمت میں حاضر رہیں۔

۱۳۔ یعنی اس کے لئے دنیوی ترقی اور ریاست وقیادت کی راہیں ہموار کیں۔

۱۴؎ یعنی اللہ کی بخشی ہوئی ان نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے مزید مال وجاہ کا حریص بن گیا ہے۔ اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ اگر آخرت برپا ہوئی تو اپنے شرک اور کفر کے باوجود وہاں بھی وہ نعمتوں سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

۱۵؎ یعنی یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ جب وہ ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کر رہا ہے نہ ہمارے رسول پر ایمان لانے کے لئے تیار ہے اور نہ ہمارے کلام پر، تو آخرت میں وہ نعمتوں کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے۔

اوپر کی آیتوں میں ان لیڈروں کی تصویر کھینچی گئی ہے جو دنیوی اعتبار سے خوشحال تھے، لیکن نبی ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اور ولید بن مغیرہ تو پوری طرح اس کا مصداق تھا۔

۱۶؎ چڑھنے میں انسان کا سانس پھولتا ہے۔ اور پھر جب چڑھائی کٹھن ہو اور دوزخ میں ہو تو وہ کیسی مشقت والا عذاب ہوگا۔

۱۷؎ اس کا یہ سوچنا لال بجھکڑ کی طرح تھا اور جو بات اس نے نبی ﷺ اور قرآن کے تعلق سے تجویز کی اس کا ذکر آگے آیت ۲۴ اور ۲۵ میں ہوا ہے۔

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾

۲۳ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا، ۱۸؎

فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾

۲۴ اور بولا یہ تو محض جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے،

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾

۲۵ یہ انسان کا کلام ہی ہے۔ ۱۹؎

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾

۲۶ عنقریب میں اسے سَقَرَ ۲۰؎ (دوزخ) میں داخل کروں گا۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾

۲۷ اور تم نے سمجھا کہ سَقَرَ (دوزخ) کیا ہے؟ ۲۱؎

لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾

۲۸ نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی۔ ۲۲؎

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾

۲۹ کھال کو جھلس دینے والی۔ ۲۳؎

عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾

۳۰ اس پر اُنیس (فرشتے) مقرر ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا ۙ وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾

۳۱ اور ہم نے دوزخ کے نگراں فرشتے بنائے ہیں۔ اور ان کی تعداد کو کافروں کے لئے فتنہ بنایا ہے، تاکہ اہلِ کتاب کو یقین آ جائے اور اہلِ ایمان کا ایمان بڑھے۔ اور اہلِ کتاب اور مؤمن کسی شک میں نہ پڑیں۔ اور جن کے دلوں میں روگ ہے وہ اور کفار کہیں کہ اس بات سے اللہ کی کیا مراد ہے ۲۴؎۔ اس طرح اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ۲۵؎۔ اور یہ قرآن انسانوں کے لئے سرتاسر نصیحت ہے۔ ۲۶؎

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿۳۲﴾

۳۲ ہرگز نہیں ۲۷؎۔ قسم ہے چاند کی، ۲۸؎

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿۳۳﴾

۳۳ اور رات کی جب وہ پلٹتی ہے۔

وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿۳۴﴾

۳۴ اور صبح کی جب وہ روشن ہو جائے،

اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿۳۵﴾

۳۵ کہ یہ (قرآن) بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، ۲۹؎

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾

۳۶ انسانوں کو خبردار کرنے والا، ۳۰؎

لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ ﴿۳۷﴾

۳۷ تم میں سے ہر اس شخص کو جو آگے بڑھنا یا پیچھے رہنا چاہے۔ ۳۱؎

كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾

۳۸ ہر شخص اپنی کمائی کے بدلہ رہن ہے۔ ۳۲؎

اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾

۳۹ سوائے داہنے ہاتھ والوں کے۔ ۳۳؎

فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَاۗءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾

۴۰ وہ جنتوں میں ہوں گے۔ وہاں وہ پوچھ رہے ہوں گے۔

۱۸؎ ان آیتوں میں اس کافر لیڈر کی حرکتیں (Actions) بیان ہوئی ہیں، جو کلام الٰہی کو سننے کے بعد ناگواری کی صورت میں اس سے ظاہر ہوئیں۔

۱۹؎ یعنی لوگوں کو اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ کافی غور وفکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ قرآن انسانی کلام ہی ہے۔ البتہ یہ بیان کی جادوگری ہے، جو لوگوں کو مسحور کر رہی ہے۔ اور بیان کی جادوگری کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ بات تو پہلے سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے ابوجہل کو یہی مشورہ دیا تھا کہ لوگوں میں قرآن کے جادو ہونے کا چرچا کیا جائے۔

۲۰؎ **سَقَر** دوزخ کا نام ہے۔ یہ **سَقَر** سے ہے جس کے معنی شدتِ حرارت کے ہیں۔

۲۱؎ یعنی دوزخ کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ دردناک عذاب کی جگہ ہے۔

۲۲؎ یعنی دوزخ کی آگ انسان کو جلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی اور پھر جلنے کے بعد بھی اسے چھوڑے گی نہیں، بلکہ جلانے کا عمل جاری رکھے گی۔ دوزخ اس کو نہ جینے دے گی اور نہ مرنے دے گی اور نہ اپنی گرفت سے آزاد ہونے دے گی۔

۲۳؎ کھال انسان کے جسم کا نازک حصہ ہوتا ہے اور تکلیف کا احساس جلد ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ دوزخ کی آگ جب کھال کو جھلس دے گی، تو انسان کا کیا حال ہوگا! اللہ تعالیٰ دوزخ کے یہ احوال سنا کر خبردار کر رہا ہے، تاکہ انسان اس سے بچنے کا سامان کرے۔

۲۴؎ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، لہٰذا اس نے دوزخ پر جو اُنیس فرشتے مقرر کئے ہیں وہ بھی یقیناً اس کا ایک حکیمانہ فیصلہ ہے۔ اگرچہ ہم اس کے اس فیصلہ کی مصلحت کو نہیں جانتے اور نہ ہمیں ان اُنیس فرشتوں کے کام کی نوعیت کا علم ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ فرشتوں کو وہ قوتیں عطا کی گئی ہیں جن کا اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر آسمان سے ان کا نزول! ملک الموت کا روحوں کو قبض کرنا وغیرہ۔ اس لئے دوزخ پر مامور فرشتوں کی تعداد کو حقیر خیال کرنا اور یہ سمجھنا کہ دوزخیوں کی کثیر تعداد کو عذاب میں مبتلا رکھنے کے لئے اُنیس کی تعداد کیسے کافی ہو سکتی ہے سراسر حماقت ہے۔ مگر کافروں نے قرآن کی اس خبر کو سن کر اسی حماقت کا اظہار کیا، جس پر اس آیت میں انہیں متنبہ کیا گیا ہے۔

رہی اس تعداد کے بیان کی مصلحت تو اس کی ایک مصلحت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ کافروں کے لئے وجہ آزمائش بنے۔ یعنی بجائے متنبہ ہونے کے وہ دوزخ کو مذاق کا موضوع بنانا چاہتے ہیں تو وہ اپنا شوق پورا کر لیں اور گمراہی میں دور نکل جائیں۔ دوسری مصلحت یہ کہ اہل کتاب کو یقین ہو جائے کہ اس تفصیل کے ساتھ دوزخ کا ذکر قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیونکہ دوزخ کا ذکر تو ان کی کتابوں میں موجود تھا، لیکن اس کا تفصیلی نقشہ قرآن نے پیش کر دیا۔ اور تیسری مصلحت یہ ہے کہ اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ کیونکہ اہل ایمان کا یہ طریقہ نہیں کہ قرآن کی ایک ایک بات کی حکمت جاننے کے بعد اس پر ایمان لائیں۔ بلکہ جو بات بھی اس میں بیان کی گئی ہے اس پر وہ ایمان لاتے ہیں۔ خواہ اس کی حکمت اللہ نے واضح فرمائی ہو یا نہ ہو۔ بندہ کا کام تو اللہ کے ارشادات پر غیر مشروط طریقہ پر ایمان لانا ہے۔ اس کے ایمان لانے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ یہ اللہ کا ارشاد ہے۔ آخرت کے احوال پر جو انسان کی نگاہوں سے مستور ہیں اہل ایمان یقین کر لیتے ہیں تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور چوتھی مصلحت یہ بیان کی گئی کہ اہل کتاب اور مؤمنوں کے لئے مخالفین کے اعتراضات تذبذب کا باعث نہ بنیں، بلکہ انہیں اطمینان ہو کہ غیب کی یہ باتیں اتنے وثوق کے ساتھ کہنے والا نبی ہی ہو سکتا ہے۔ اور پانچویں مصلحت یہ ہے کہ جو لوگ بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہیں وہ اور منکرین اس پر حیرت کا اظہار کر کے رہ جائیں۔

واضح رہے کہ بعض مفسرین نے انیس فرشتوں کے جہنم پر مقرر کئے جانے کی مختلف توجیہیں کی ہیں، مگر یہ سب قیاسی باتیں اور تکلفات ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس تعداد کے مقرر کئے جانے کی کوئی وجہ نہیں بتلائی اور اجمالی بات بیان فرما کر ہمارے ایمان کا امتحان لینا چاہا ہے، تو ہم کیوں تعداد کی بحث میں پڑیں؟

۲۵۔ یعنی یہ نہ سمجھو کہ اللہ کے پاس فرشتوں کے لشکر کی کمی ہے اس لئے دوزخ پر صرف ۱۹ فرشتے مقرر کئے گئے ہیں۔ یہ تعداد بظاہر قلیل ہے، لیکن وہ اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے پوری جہنم کو کنٹرول کرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ جب انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ ایک آدمی جراثیمی ہتھیار استعمال کر کے ہزاروں فوجیوں کو بیک وقت ہلاک کر سکتا ہے اور ایٹم بم استعمال کر کے لاکھوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے، تو فرشتے آخر فرشتے ہیں۔ ان کی غیر معمولی قوت اور ان کے ان وسائل کا جو اللہ نے ان کو خاص طور سے بے شمار جہنمیوں کو سزا دینے کے لئے عطا کئے ہوں گے کون اندازہ کر سکتا ہے۔ پھر جب انسان کی قابلیت کا یہ حال ہے کہ وہ اسکڈ میزائل (Scud Missile) اور پٹریاٹ (Petriot) کے ذریعہ ہزاروں میل دوری کے مقامات کو نشانہ بنا لیتا ہے، تو فرشتوں کے لئے وسیع جہنم میں دوزخیوں کو نشانہ بنانا کیا مشکل ہے۔

اللہ کے لشکر بکثرت ہیں اور ان کی تعداد کا علم بھی اسی کو ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے لشکروں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

۲۶۔ یعنی یہ قرآن جو جہنم کے احوال بیان کر رہا ہے، لوگوں کے لئے نصیحت پذیری کا سامان ہے۔ عقلمند ہیں وہ لوگ جو بحثوں میں الجھے بغیر اس کی نصیحت پر کان دھریں۔

۲۷۔ یعنی قرآن کو انسانی کلام یا جادو سمجھنا ہرگز صحیح نہیں۔

۲۸۔ یہ قسم شہادت اور دلالت کے معنی میں ہے۔

۲۹۔ یعنی قرآن کا نزول اللہ کی ایک بہت بڑی نشانی کا ظہور ہے۔ جو انسان کو اپنے رب کی صحیح معرفت بخشتا ہے اور اس کی زندگی کی غایت بیان کرتا ہے۔ یعنی توحید کے ساتھ جزائے عمل کی خبر دیتا ہے۔ یہ نشانی کلامِ الٰہی کی شکل میں ہے، اس لئے نہایت عظیم ہے۔ اور اس کی تائید ان نشانیوں سے ہوتی ہے جو آفاق میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر چاند جو اپنے خالق کی صفتِ جمال کے ساتھ اس کے الٰہِ واحد ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اور رات اور دن کا یہ نظام کہ رات اپنی تاریکی کے ساتھ رخصت ہو جاتی ہے اور صبح اپنی روشنی کے ساتھ نمودار ہو جاتی ہے، اللہ کی عظیم قدرت پر بھی دلالت کرتی ہے، اور اس بات پر بھی کہ وہ حق و عدل کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ نیز اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ اس عالم کے بطن سے قیامت کی صبح نمودار ہونے والی ہے۔ اس طرح کائنات کے یہ اشارات اور قرآن کی ناطق شہادت دونوں کو تم بالکل ہم آہنگ پاؤ گے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کا نزول اللہ کی نہایت عظیم نشانی کا ظہور ہے۔

۳۰۔ یعنی قرآن کا اولین مقصد لوگوں کو بدلہ کے دن سے خبردار کرنا ہے۔

۳۱۔ یعنی اس سے متنبہ ہو کر جو لوگ اللہ کی راہ میں آگے بڑھنا چاہیں اور اپنے مستقبل کا سامان کرنا چاہیں کریں۔ اور جو لوگ اس تنبیہ کے باوجود پیچھے رہنا چاہیں، یعنی اللہ کی راہ میں قدم رکھنا نہ چاہیں اور اپنے مستقبل کے لئے کوئی سامان کرنا نہ چاہیں، وہ اپنی ناعاقبت اندیشی کی سزا بھگتیں۔

۳۲۔ اس کی تشریح سورۂ طور، نوٹ ۲۱۔ میں گزر چکی۔

۳۳۔ داہنے ہاتھ والوں سے مراد مؤمنین صالحین ہیں جن کا نامۂ عمل ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

ان کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت سے رخ پھیر رہے
ہیں، گویا یہ بِدکے ہوئے گدھے ہیں، جو شیر
سے ڈر کر بھاگے ہوں۔ (القرآن)

عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾

وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿۴۵﴾

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۴۶﴾

حَتّٰۤى اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿۴۷﴾

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿۴۸﴾

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۹﴾

كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿۵۰﴾

فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿۵۱﴾

بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿۵۲﴾

كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۵۳﴾

كَلَّاۤ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿۵۴﴾

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

۴۱ مجرموں کے بارے میں۔

۴۲ تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ ۳۴؎

۴۳ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہیں تھے، ۳۵؎

۴۴ اور نہ مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے، ۳۶؎

۴۵ اور بحث کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی بحث کرتے تھے، ۳۷؎

۴۶ اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔

۴۷ یہاں تک کہ یقینی چیز ہمارے سامنے آ گئی۔ ۳۸؎

۴۸ تو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے لئے کچھ بھی مفید نہ ہوگی۔ ۳۹؎

۴۹ ان کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ نصیحت سے رخ پھیر رہے ہیں،

۵۰ گویا یہ بدکے ہوئے گدھے ہیں،

۵۱ جو شیر سے ڈر کر بھاگے ہوں۔ ۴۰؎

۵۲ بلکہ ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ اسے کھلا صحیفہ دیا جائے۔ ۴۱؎

۵۳ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ آخرت کا خوف نہیں رکھتے۔ ۴۲؎

۵۴ ہرگز نہیں یہ تو ایک نصیحت ہے۔ ۴۳؎

۵۵ تو جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

۵۶ اور یہ نصیحت حاصل نہیں کر سکتے، مگر یہ کہ اللہ چاہے ۴۴؎۔ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے ۴۵؎۔ اور وہی اس کا اہل ہے کہ بخش دے۔ ۴۶؎

۳۴۔ اہلِ ایمان جنت میں کافروں کے بارے میں آپس میں بات چیت کر رہے ہوں گے کہ ان کا کیا حال ہوا؟ ان کی اس خواہش پر انہیں دوزخیوں سے براہِ راست بات کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ وہ جنت میں رہتے ہوئے مجرمین سے جو دوزخ میں ہوں گے سوال کریں گے، جس کا انہیں ان کی طرف سے جواب بھی ملے گا جو آگے بیان ہوا ہے۔ جنت سے دوزخ بہت دوری پر ہوگی، مگر ان سے بات چیت بالکل ممکن ہوگی۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں تو یہ بات انسان کے لئے تعجب کی ہوسکتی تھی، مگر موجودہ زمانہ میں جب ٹیلیفون کے ذریعہ ہزاروں میل کی دوری پر دو شخصوں کے درمیان بات چیت کرنا آسان ہوگیا ہے۔ نیز وائرلیس وغیرہ کے ذریعہ یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ زمین پر رہتے ہوئے خلاء میں پرواز کرنے والے انسان سے گفتگو کی جائے، قرآن کا یہ بیان کہ جنت میں رہنے والے دوزخ میں پڑے ہوئے مجرموں سے بات چیت کریں گے، تعجب کی بات نہیں رہی۔ گویا ان آلات کی ایجاد سے قرآن کے بیان کی صداقت اور زیادہ روشن ہوگئی۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (حم السجدہ: ۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق (اطرافِ عالم) میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ حق ہے۔'' آج حقیقت بن کر اُبھر رہی ہے۔

۳۵۔ اس سے نماز کی اہمیت اور زیادہ ابھر کر سامنے آئی ہے کہ اس کے ضائع کرنے کا احساس مجرموں کو دوزخ میں ہوگا۔ نماز اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اور ایمان اس کے لئے شرط ہے۔ اس کے بغیر نہ نماز، نماز کہلاسکتی ہے اور نہ اس کو اللہ کے ہاں قبولیت حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ وغیرہ عبادات کا معاملہ بھی ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ کی شریعت کے مکلف (یعنی جن پر عمل کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہو) تمام انسان ہیں۔ لیکن اس کی تعمیل اور عنداللہ اس کی قبولیت کے لئے ایمان شرطِ لازم ہے۔

اس آیت کو پڑھ کر ان مسلمانوں کو بھی ہوش میں آجانا چاہئے، جو نماز سے بالکل غافل ہیں۔

۳۶۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۃ الحاقہ نوٹ ۳۲۔

۳۷۔ دنیا میں تو یہ لوگ خدا و آخرت اور قرآن و رسالت کے بارے میں طرح طرح کی بحثیں کھڑی کرتے رہے، اور دین کی باتوں کو انہوں نے اعتراضات کا نشانہ بنادیا۔ لیکن اپنی اس زبردست غلطی کا احساس انہیں دوزخ میں پہنچ کر ہوگا۔

۳۸۔ یعنی موت جس کا آنا یقینی تھا اور جو ان باتوں کو سامنے لے آئی، جن کو دیکھ کر یقین آیا کہ یہ باتیں حقیقت تھیں۔

۳۹۔ اوپر مجرمین کا بیان ختم ہوا۔ اب اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ جن لوگوں نے مجرمانہ روش اختیار کی ہے، وہ شفاعت پر تکیہ کئے ہوئے ہیں کہ اگر آخرت برپا ہوئی تو فلاں اور فلاں کی سفارش سے ہم نجات پائیں گے۔ حالانکہ نجات کیلئے کسی کی بھی سفارش کام نہ آسکے گی۔ نجات کا دارومدار سفارش پر نہیں، بلکہ ایمان اور عملِ صالح پر ہے اور یہ لوگ جب آخرت کے منکر ہوکر جرم پر جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، تو ان کے لئے سفارش کا دروازہ بالکل بند ہوگا۔ اور جن کو انہوں نے اللہ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھ کر معبود بنالیا تھا، وہ ان کی سفارش کے لئے سرے سے موجود ہی نہیں ہوں گے۔

۴۰۔ یعنی جس طرح وحشی گدھے شیر سے بدک کر بھاگ جاتے ہیں، اسی طرح یہ نادان لوگ پیغمبر کی نصیحت سے گھبرا کر بھاگ رہے ہیں۔ قرآن اور اس کے پیغمبر سے ان کا یہ فرار سراسر ان کی حماقت ہے۔

۴۱۔ یعنی یہ لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ اللہ نے اپنی کتاب اس کے رسول پر نازل کی ہے۔ بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اگر اللہ کو کتاب نازل کرنا ہے تو وہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں اس کا ایک ایک نسخہ دے دے۔ ان کے نزدیک رسول کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ اللہ براہِ راست

ہم کو اپنی کتاب عطاء کرے۔ یہ تھیں ان کی متکبّرانہ باتیں اور ان کا یہ مطالبہ سراسر نامعقول تھا۔

۴۲؎ یعنی ایسا نہیں ہے کہ قرآن کا وحیِ الٰہی ہونا ایک واضح حقیقت نہ ہو اور اس وجہ سے یہ لوگ اس سے گریز کر رہے ہوں، بلکہ اس سے گریز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں آخرت کی جوابدہی کا کوئی احساس نہیں ہے۔ وہ اس سے بالکل بے پروا ہیں۔

آخرت کا خوف قرآن کے اِنذار (تنبیہ) سے پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ آدمی اس پر دھیان دے۔ پھر جب آخرت کا خوف پیدا ہو جاتا ہے تو نصیحت کی تمام باتیں سننا اور قبول کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ مگر جب آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور جوابدہ نہ سمجھے اور آخرت کا خوف دلانے کے باوجود اس کا کوئی اثر قبول نہ کرے تو نصیحت بھری یہ کتاب (قرآن) اس پر کچھ بھی اثر نہیں کر سکتی۔

۴۳؎ یعنی قرآن ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے نصیحت اور یاددہانی ہے۔

۴۴؎ یعنی اچھی طرح جان لو کہ تمہارا نصیحت حاصل کرنا بھی اللہ کی مشیت کے تحت ہی ہے۔ اگر اس کی مشیت نہ ہو تو تم نصیحت بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ تمہیں نصیحت حاصل کرنے کا جو اختیار حاصل ہے وہ اللہ کے عطا کرنے سے حاصل ہوا ہے۔ ورنہ تمہارا اپنا اختیار کچھ بھی نہیں ہے۔

۴۵؎ اللہ اپنی عظمت، اپنی کبریائی اور اپنے الٰہ ہونے کی بنا پر اس بات کا مستحق ہے کہ بندے اس سے ڈریں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں۔

۴۶؎ گناہوں کو بخش دینے کا اہل بھی وہی ہے۔ ظاہر ہے جو خالق اور رب ہے وہی اپنے بندوں کے گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو بخش سکے۔ اس سے عیسائیوں کے اس عقیدے کی تردید ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنے پیروؤں کے گناہ بخش دیں گے۔

۷۵۔ القیمۃ

نام پہلی آیت میں قیامت کے دن کی قسم کھائی گئی ہے۔اور پوری سورہ قیامت ہی کے مباحث پر مشتمل ہے۔اس لئے اس کا نام 'القیٰمۃ' ہے۔

زمانۂ نزول اس کے نزول کا زمانہ مکہ کا ابتدائی دور ہے۔

مرکزی مضمون قیامت کے بارے میں جو شبہات وارد کئے جارہے تھے،ان کو دور کر کے اس کا یقین پیدا کرنا ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۶ میں قیامت کی قطعیت کو پیش کرتے ہوئے شبہات کو دور کیا گیا ہے۔

آیت ۷ تا ۱۵ میں قیامت کے کچھ احوال پیش کئے گئے ہیں۔

آیت ۱۶ تا ۱۹ کا مضمون بطورِ جملۂ معترضہ ہے۔یعنی سلسلۂ کلام کو کاٹ کر نبی ﷺ کو وحی اخذ کرنے کے تعلق سے بروقت ہدایت دی گئی ہے۔

آیت ۲۰ تا ۲۵ میں منکرین کو ان کی دنیا پرستی پر متنبہ کرتے ہوئے قیامت کے دن ظاہر ہونے والی،نیکوکاروں کی سرخروئی اور بدکاروں کی سیاہ روئی کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔

آیت ۲۶ تا ۳۰ میں موت کی تصویر پیش کی گئی ہے جو قیامت کا پیش خیمہ ہے۔

آیت ۳۱ تا ۳۵ میں منکرین قیامت کے رویہ پر انہیں ملامت کی گئی ہے۔

آیت ۳۶ تا ۴۰ میں دوبارہ زندہ کئے جانے پر قاطع حجت پیش کی گئی ہے۔

سُوْرَةُ الْقِيَامَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ﴿۱﴾
وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۭ﴿۲﴾
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۭ﴿۳﴾
بَلٰي قٰدِرِيْنَ عَلٰٓي اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾
بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۚ﴿۵﴾
يَسْـَٔـلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۭ﴿۶﴾
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ﴿۷﴾
وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ﴿۸﴾
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ﴿۹﴾
يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۚ﴿۱۰﴾
كَلَّا لَا وَزَرَ ۭ﴿۱۱﴾
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ۨالْمُسْتَقَرُّ ۭ﴿۱۲﴾
يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۭ﴿۱۳﴾
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰي نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ﴿۱۴﴾
وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۭ﴿۱۵﴾
لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾
فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

۷۵۔ سُوْرَةُ الْقِيٰمَة

آیات: ۴۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ نہیں ا ے ، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی، ۲ ے

۲ اورنہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ ۳ ے

۳ کیاانسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کرسکیں گے۔ ۴ ے

۴ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی پور پور تک ٹھیک بنادینے پر قادر ہیں۔ ۵ ے

۵ مگرانسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے بداعمالیاں کرتا رہے۔ ۶ ے

۶ پوچھتا ہے کب آئے گا قیامت کا دن۔

۷ تو (سن لے) جب آنکھیں چندھیا جائیں گی، ۷ ے

۸ اور چاند بےنور ہوجائے گا، ۸ ے

۹ اورسورج اور چاند اکٹھے کردئے جائیں گے، ۹ ے

۱۰ اس روز انسان کہے گا، کہاں بھاگ کر جاؤں؟ ۱۰ ے

۱۱ نہیں۔ کہیں پناہ نہیں۔ ۱۱ ے

۱۲ اس روز تیرے رب ہی کی طرف ٹھکانا ہوگا۔ ۱۲ ے

۱۳ اس روز انسان کو بتادیا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ ۱۳ ے

۱۴ دراصل انسان آپ خود اپنے اوپر حجت ہے، ۱۴ ے

۱۵ اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ ۱۵ ے

۱۶ (اے نبی!) اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ ۱۶ ے

۱۷ اس کو جمع کرادینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۷ ے

۱۸ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی پیروی کرو۔ ۱۸ ے

۱۹ پھر اس کی وضاحت کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۹ ے

۱۔ قسم سے پہلے لا (نہیں) کسی ایسی بات کی تردید کے لئے آتا ہے، جو اس بات کے خلاف ہو، جس کے لئے قسم کھائی جاری ہے۔ مثلاً لا واللہ (نہیں۔ اللہ کی قسم) ایسے موقع پر کہا جاتا ہے۔ جب کسی شخص کے کسی خیال کی تردید کرتے ہوئے اپنی بات کو تاکید کے ساتھ پیش کرنا مقصود ہو۔

۲۔ اس آیت میں منکرینِ قیامت کے اس خیال کی کہ جزا و سزا کا معاملہ پیش نہیں آئے گا، تردید کرتے ہوئے قیامت کے دن کو امر یقینی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم قیامت کا کتنا ہی انکار کرو، اس کا ظہور میں آنا قطعی ہے اور ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

۳۔ انسان جب کسی برائی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا نفس اسے ملامت کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کے ساتھ ناروا سلوک کرنے یا اس پر ظلم کرنے یا جھوٹ بولنے یا فضول خرچی کرنے پر انسان کا ضمیر، اگر وہ بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے، اسے ضرور ٹوکتا ہے کہ یہ کام تو نے غلط کیا اور اس پر وہ اسے ملامت کرتا ہے۔ قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل تو کر دیا، لیکن اس کے بعد وہ پچھتایا کہ یہ کام اسے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس طرح نفس کا برائی پر ملامت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بھلائی اور برائی میں تمیز کرنا انسان کی فطرت میں ودیعت ہوا ہے۔ اور وہ اپنے اعمال کے بارے میں اپنے رب کے حضور جوابدہ ہے۔ برائی کے ارتکاب پر وہ سزا کا مستحق ہے اور بھلائی پر اچھی جزا کا۔ نفسِ انسانی کی یہ صفت روزِ جزا کی شہادت پیش کرتی ہے۔ اگر جزا و سزا کا معاملہ پیش آنے والا نہ ہوتا اور انسان اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار نہ ہوتا، تو برائی کے ارتکاب پر اسکا نفس اسے ملامت نہ کرتا اور نہ کسی دوسرے شخص کے ظلم کرنے پر اس کا نفس اس ظالم کو ملامت کرتا۔

۴۔ منکرینِ قیامت کا بہت بڑا شبہ یہ تھا کہ جب انسان کا جسم مرنے کے بعد سڑ گل جاتا ہے اور وہ بوسیدہ ہڈیاں ہو کر رہ جاتا ہے اور ہڈیاں بھی بکھر جاتی ہیں، تو پھر ان کو کس طرح جمع کر کے جسم کی تشکیل کی جا سکے گی۔ اور اس کو زندہ انسان بنایا جائے گا؟ یہ شبہ دراصل اللہ کی قدرت کا صحیح اندازہ نہ کرنے کی بنا پر پیدا ہو رہا تھا۔ اس لئے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے یہ سوال کیا گیا کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کرنے پر قادر نہیں ہیں؟ ظاہر ہے اللہ کی قدرت کا یہ محدود تصور سراسر غلط ہے۔ اور یہ چیز مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ اللہ منتشر اجزاء کو جمع بھی کر دیتا ہے اور ایک بے جان چیز میں جان بھی ڈال دیتا ہے۔ پھر مردہ انسان کے منتشر اجزاء کو جمع کرنا اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟

۵۔ یعنی ہڈیوں کو جمع کر کے دوبارہ ان کا ڈھانچہ کھڑا کر دینے ہی پر نہیں، بلکہ انسان کے جسم کے ایک ایک جزء کو، یہاں تک کہ اس کی انگلیوں کے پور تک، جو بہت نازک ہوتے ہیں، دوسری مرتبہ ٹھیک ٹھیک پیدا کرنے پر ہم قادر ہیں۔ انسان کا جسم جیسا تھا ویسا ہی اسے قیامت کے دن عطا کیا جائے گا تاکہ جس جسم سے اعمال کا صدور ہوا تھا، وہی جسم اعمال کی نوعیت کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

۶۔ یعنی روزِ جزا کا انکار کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ جو بداعمالیاں کرتا رہا ہے، آئندہ بھی کرتا رہے اور ایک پابند آئین زندگی اسے گزارنا نہ پڑے۔ کیونکہ فسق و فجور میں دنیا کی لذتیں ہیں، جبکہ متقیانہ زندگی میں صبر کی خشکی ہے۔

۷۔ سوال قیامت کی تاریخ کے بارے میں تھا، لیکن جواب میں قیامت کے احوال پیش کئے جا رہے ہیں۔ کیونکہ جس طرح موت کا آنا یقینی ہے جب کہ اس کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہوتی، اسی طرح قیامت کا آنا بھی یقینی ہے، اگرچہ اس کی تاریخ سوائے اللہ کے کسی کو نہیں معلوم۔ اس لئے اصل بات جس کی ہر شخص کو فکر کرنا چاہیئے یہ ہے کہ جب قیامت آئے گی تو یہ حادثہ کتنا زبردست ہوگا اور اس روز آدمی کس طرح نجات پا سکے گا؟ قرآن نے جواب میں اسی بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

قیامت جب برپا ہوگی تو اس کی ہولناکیاں ایسی زبردست ہوں گی کہ انسان ان کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکے گا۔ سورۂ ابراہیم میں بھی یہ مضمون گزر چکا کہ:

اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُ۔ (ابراہیم: ۴۲)

''وہ تو ان کو اس دن تک کے لئے مہلت دے رہا ہے جب آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔''

۸۔ قیامت کے دن چونکہ سورج کی چادر لپیٹ دی جائے گی۔ جیسا کہ سورۂ تکویر میں ارشاد ہوا ہے: اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ (جب سورج لپیٹ دیا جائے گا) تو چاند بے نور ہو کر رہ جائے گا گویا کہ اسے گہن لگ گیا ہے۔

۹۔ اس وقت چاند اور سورج اپنے اپنے مدار پر ہیں۔ لیکن قیامت جب برپا ہوگی تو یہ توازن برقرار نہیں رہے گا۔ سورج اور چاند دونوں اکٹھے ہو جائیں گے۔ ان کے اکٹھا ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

۱۰۔ یعنی آج تو انسان قیامت کے بارے میں غیر ضروری سوالات میں الجھ رہا ہے۔ لیکن جب وہ گھڑی نمودار ہوگی تو انسان اس کی ہولناکیوں کو دیکھ کر بھاگنا چاہے گا۔

۱۱۔ مگر بھاگنے کے لئے اسے کوئی جائے پناہ نہ مل سکے گی۔

۱۲۔ یعنی اللہ کے حضور پیشی ہوگی۔

۱۳۔ آگے بھیجنے سے مراد انسان کے اچھے اور برے اعمال ہیں جن کے نتائج آخرت میں ظاہر ہوں گے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد وہ اعمال ہیں جو اسے دنیا میں کرنا چاہیئے تھے، لیکن اس نے نہیں کئے اور آخرت کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر رہا۔

۱۴۔ یعنی انسان اپنے آپ پر حجت ہے۔ اس کا وجدان پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ ایک اخلاقی ذمہ داری رکھنے والی مخلوق ہے۔ بھلائی اور برائی دونوں کے اثرات و نتائج الگ الگ ہیں اور یہ کہ وہ اپنے رب کے حضور اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے۔ خارجی دلائل سے قطعِ نظر انسان کے نفس کی یہ داخلی شہادت جزا و سزا کی ایسی شہادت ہے، جس سے کسی انسان کے لئے انکار ممکن نہیں۔

۱۵۔ یعنی جزا و سزا سے انکار کے لئے انسان بہانے بہت سے تراش سکتا ہے اور بہت کچھ سخن طرازیاں کر سکتا ہے۔ لیکن جزا و سزا کا برحق ہونا اس پر بالکل روشن ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت کا نور اسی حقیقت کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔

۱۶۔ آیت ۱۶ تا ۱۹ جملۂ معترضہ کے طور پر ہیں۔ یعنی سلسلۂ کلام کو کاٹ کر نبی ﷺ کو بروقت ایک ہدایت دی گئی ہے۔ آپ جیسا کہ بخاری کی روایت ہے، جبریلؑ سے وحی حاصل کرنے میں جلدی کرتے اور آیتوں کو اپنی زبان سے دہراتے تاکہ کوئی بھول نہ ہو۔ اس موقع پر آپ کو ہدایت دی گئی کہ وحی اخذ کرنے کیلئے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جبریلؑ کی زبان سے وحی کو پہلے پوری طرح سن لیں اس کے بعد اس کو دہرائیں۔ اس طرح آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ وحی کے معاملہ میں کوئی بھول آپ سے نہیں ہوگی۔ کیونکہ قرآن کو آپ کے سینہ میں محفوظ کرا دینے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

ایک سلسلۂ کلام میں دوسری بات کا ذکر بظاہر بے ربط ہوتا ہے۔ لیکن خطابت میں جب موقع کی مناسبت سے یا ضرورتاً کوئی دوسری بات کہی جاتی ہے، تو اس کا کوئی اثر ربطِ کلام پر نہیں پڑتا۔ امام رازی نے اس بات کو بڑی اچھی مثال سے واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک استاد جب اپنے شاگرد کو سبق پڑھا رہا ہو اور شاگرد ادھر ادھر دیکھنے لگے، تو استاد درس کے دوران شاگرد سے کہتا ہے کہ ادھر ادھر نہ دیکھ اور پھر سبق پڑھاتا ہے۔ اب اگر یہ سبق اس جملۂ معترضہ کے ساتھ نقل کیا جائے تو جملۂ معترضہ کی وجہ جس کو معلوم نہیں ہوگی وہ درس کے دوران کی اس بات کو نامناسب خیال کرے گا۔ لیکن جس کو صورتِ واقعہ معلوم ہو وہ اس کلام کو حسنِ ترتیب پر محمول کرے گا۔ (التفسیر الکبیر ج ۲۹ ص ۲۲۳)

اور حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ کو دورانِ وحی یہ ہدایت دینا کہ آپ اس کو اخذ کرنے میں جلدی نہ کریں، قرآن کے اپنی اصل شکل میں محفوظ ہونے کا ثبوت ہے، کہ اگر سلسلۂ کلام کو کاٹ کر کوئی بات اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی ہے تو وہ بھی بعینہٖ نقل ہوئی ہے۔ اگر قرآن نبی ﷺ کا تصنیف کردہ ہوتا تو

اس میں یہ باتیں موجود نہ ہوتیں۔

۱۷۔ جمع کر دینے سے مراد قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی تالیف ہے حسن ترتیب کے ساتھ۔ اور پڑھا دینے سے مراد نبی ﷺ کی زبان سے اس کو صحت کے ساتھ ادا کرا دینا ہے۔ ان دونوں باتوں کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا تھا۔ چنانچہ قرآن جس کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، وہ اللہ ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ اور کلام کی اندرونی شہادت بھی یہی ہے کہ یہ اللہ ہی کی تالیف و ترتیب ہے۔ کیونکہ نظم کلام پر غور کرنے سے کتنے ہی اسرار منکشف ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں بعض تجدد پسند لوگوں نے قرآن کو اس کی نزولی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مگر وہ اس میں بری طرح ناکام ہیں۔ کیونکہ نزولی ترتیب کو پوری تفصیل اور قطعیت کے ساتھ جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے بہ تقاضائے حکمت اپنی کتاب کو نزولی ترتیب کے بجائے ایک دوسری ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے، تو کسی کو کیا حق ہے کہ وہ اس کی ترتیب کو بدل دے؟

یہاں اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جانا چاہئے کہ قرآن کو خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یا خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جمع کیا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ایک مرتب کتاب کی شکل میں موجود نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نبی ﷺ کے زمانہ ہی میں اللہ کی ہدایت کے مطابق مرتب ہو گیا تھا۔ چنانچہ نماز میں اسی ترتیب کے ساتھ آیتیں اور سورتیں پڑھی جاتی تھیں۔ اور حدیث میں آتا ہے کہ رمضان میں حضرت جبریل نبی ﷺ سے ملاقات فرماتے اور آپ کے ساتھ قرآن کا دور کرتے (بخاری کتاب الوحی)۔ یہ دور ظاہر ہے کہ ایک مرتب کتاب ہی کا ہو سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر نے جو خدمت انجام دی، وہ یہ تھی کہ قرآن کے جو اجزاء مختلف کاتبانِ وحی کے پاس موجود تھے ان کو انہوں نے جمع کرا دیا۔ نبی ﷺ قرآن کے جو اجزاء لکھواتے رہے وہ متعدد صحابہ کے پاس موجود تھے۔ ان کتابت شدہ اجزاء کو جمع کرنے کا کام حضرت ابوبکر نے چند صحابہ کے سپرد کیا اور انہوں نے ان کو جمع کیا اور آیات اور سورتوں کی ترتیب وہی رکھی جو نبی ﷺ کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی۔ بالفاظ دیگر قرآن اسی ترتیب کے ساتھ جو متداول ہے، حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا اور نماز میں اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔ البتہ اس کے کتابت شدہ اجزاء کو مصحف کی شکل میں جمع کرنے کا کام حضرت ابوبکر نے انجام دیا۔ رہا حضرت عثمان کا قرآن کو جمع کرنا تو وہ اس اعتبار سے تھا کہ انہوں نے قریش کے عربی تلفظات کی رعایت کرتے ہوئے مصحف کی کتابت کروائی اور اسے رائج کر دیا۔ قرآن کے بعض الفاظ کا تلفظ مختلف قبائل میں مختلف تھا۔ جس سے معنی کا کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا لیکن ان کے دور میں جب عجمیوں کی کثرت ہو گئی، تلفظ کا یہ اختلاف مسئلہ بن گیا اس لئے حضرت عثمان نے ان کے فرق کو مٹایا اور ایک ہی قرأت پر سب کو جمع کر دیا اور اس کے مطابق قرآن کے نسخے تیار کر کے ان کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ تلفظ کے فرق کی مثال لفظ 'مصیطر' ہے جو سورۂ غاشیہ آیت ۲۲ میں آیا ہے۔ اس کا تلفظ ''ص'' سے بھی کیا جا سکتا ہے اور 'س' سے بھی۔ اسی لئے اس لفظ کے اوپر چھوٹا '' س '' لکھ دیا جاتا ہے۔ مگر اس سے معنی کا کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں یعنی جبر کرنے والا۔

۱۸۔ وحی اگرچہ حضرت جبریل لے کر نازل ہوتے تھے لیکن کلام چونکہ اللہ تعالیٰ کا تھا، اس لئے جبریل کی قرأت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قرأت سے تعبیر فرمایا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب جبریل وحی نازل کر چکیں تب اے نبی! تم اس کی قرأت کرو۔

۱۹۔ یہ نبی ﷺ کے لئے مزید اطمینان کی بات فرمائی کہ آیات کا مدعا واضح کرنا بھی اللہ کے ذمہ ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے بھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ قرآن میں کئی آیتیں ایسی ہیں جو بطور تبیین (توضیح و تشریح) نازل ہوئی ہیں۔ نیز آپ پر قرآن کے علاوہ بھی وحی نازل ہوئی تھی جس میں تفصیلی احکام وغیرہ دئے گئے ہیں، جو احادیث صحیحہ میں محفوظ ہیں۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾

۲۰ ہرگز نہیں ۲۰ ۔ بلکہ تم لوگ جلد حاصل ہونے والی دنیا سے محبت کرتے ہو، ۲۱ ۔

وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾

۲۱ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾

۲۲ اس روز کتنے چہرے تروتازہ ہوں گے، ۲۲ ۔

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾

۲۳ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۳ ۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾

۲۴ اور کتنے چہرے اس دن اداس ہوں گے، ۲۴ ۔

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾

۲۵ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ معاملہ ہونے والا ہے۔ ۲۵ ۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾

۲۶ ہرگز نہیں ۲۶ ۔ جب جان ہنسلی تک پہنچ جائے گی، ۲۷ ۔

وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ﴿۲۷﴾

۲۷ اور کہا جائے گا ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ ۲۸ ۔

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾

۲۸ اور وہ سمجھے گا کہ یہ جدائی کا وقت ہے، ۲۹ ۔

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾

۲۹ اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی، ۳۰ ۔

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾

۳۰ اس دن تیرے رب کی طرف جانا ہوگا۔ ۳۱ ۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾

۳۱ مگر اس نے نہ سچائی کو قبول کیا اور نہ نماز پڑھی، ۳۲ ۔

وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾

۳۲ بلکہ جھٹلایا اور منہ موڑا، ۳۳ ۔

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾

۳۳ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔ ۳۴ ۔

اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾

۳۴ افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے!

ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾

۳۵ پھر افسوس ہے تجھ پر افسوس ہے! ۳۵ ۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾

۳۶ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ ۳۶ ۔

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾

۳۷ کیا وہ منی کی ایک بوند نہ تھا جو (رحم میں) ڈالی جاتی ہے، ۳۷ ۔

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾

۳۸ پھر وہ علقہ ہوا ۳۸ ۔ پھر (اللہ نے) اس کا جسم بنایا اور اسے درست کیا، ۳۹ ۔

فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾

۳۹ پھر ۴۰ ، اس سے جوڑا بنایا مرد اور عورت۔ ۴۱ ۔

اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

۴۰ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ ۴۲ ۔

۲۰۔ یہاں سے سلسلۂ کلام پھر اسی بات کی طرف مڑتا ہے جو جملۂ معترضہ سے پہلے چلی آ رہی تھی۔ کلّا (ہرگز نہیں) کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ یوم جزا کا انکار اس بنا پر نہیں کرتے کہ اس کی دلیل واضح نہیں ہے۔

۲۱۔ جزا و سزا کی حجت تو تمہارے اپنے نفس میں بھی موجود ہے۔ لیکن تمہارے انکار کی اصل وجہ دنیا کی محبت اور نقد حاصل ہونے والا فائدہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا فائدہ ادھار ہے ادھار کی خاطر نقد فائدہ کو کون چھوڑ دے، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ دنیا کا فائدہ بہت مختصر اور عارضی ہے اور آخرت کا فائدہ بہت بڑا اور مستقل ہے۔

۲۲۔ یہ روزِ جزا پر ایمان لا کر نیک عمل کرنے والے لوگوں کے چہرے ہوں گے۔

۲۳۔ اس آیت کا واضح مفہوم یہی ہے کہ قیامت کے دن کامیاب ہونے والے لوگ اپنے رب کو دیکھنے کی سعادت حاصل کر رہے ہوں گے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ عِیَانًا۔ (بخاری کتاب التوحید)

''تم عنقریب اپنے رب کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔''

اور اس سلسلہ میں دوسری حدیثیں بھی وارد ہوئی ہیں۔ اور علامہ ابن کثیر نے متعدد حدیثیں نقل کر کے لکھا ہے کہ اللہ کی رویت مؤمنین کو قیامت کے دن ہوگی۔ اس مسئلہ پر صحابہ، تابعین اور اس امت کے سلف کا اتفاق ہے نیز ائمہ اسلام کے درمیان بھی یہ متفق علیہ بات ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۵۰)

۲۴۔ یہ کافروں کے چہرے ہوں گے اور اپنے جرم کی وجہ سے ان پر اُداسی چھائی ہوئی ہوگی۔

۲۵۔ یعنی ان کو کڑی سزا ملنے والی ہے جو ان کی کمر توڑ کر رکھ دے گی۔ بالفاظ دیگر ناقابلِ برداشت مصیبت ان پر ٹوٹ پڑے گی۔

۲۶۔ یعنی تم لوگوں کا یہ خیال کہ آدمی مر کر بالکل فنا ہو جاتا ہے ہرگز صحیح نہیں۔ موت کے بعد جسم تو سڑ گل جاتا ہے، لیکن روح باقی رہتی ہے اور جسم سے جدا ہوتے ہی اپنے رب کی طرف چلی جاتی ہے۔

۲۷۔ یہ جاں کنی کی حالت کا نقشہ ہے جو پیش کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان میں یہ احساس پیدا ہو کہ اسے بہر حال ایک دن مرنا ہے اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کرنا ہے۔

۲۸۔ لوگ جب کسی مریض کو آخری حالت میں دیکھ لیتے ہیں اور علاج معالجہ سے مایوس ہو چکے ہوتے ہیں، تو جھاڑ پھونک کرنے والے کو بلاتے ہیں، تاکہ اس تدبیر سے اسے افاقہ ہو۔ مگر جب موت کا وقت آ جاتا ہے تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ چونکہ عربوں میں جھاڑ پھونک کا رواج تھا، اس لئے اس کا خاص طور سے حوالہ دیا گیا۔ واضح رہے کہ اسلام نے جھاڑ پھونک (رُقیہ) کو جس میں مشرکانہ کلمات ہوتے ہیں حرام اور باطل قرار دیا اور شفایابی کے لئے دعائیہ کلمات کی تعلیم دی، جن میں توحید کا اقرار اور اللہ پر توکل کا اظہار ہے۔

۲۹۔ یعنی آدمی کو یقین ہوگا کہ اس کے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آ پہنچا۔

۳۰۔ یہ اس کی بے بسی کی تصویر ہے کہ اپنی جن ٹانگوں کے ذریعہ وہ سرگرمیاں دکھاتا تھا، وہ موت کے وقت اتنی کمزور ہو جاتی ہیں کہ ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔

۳۱۔ یعنی روح جسم سے پرواز کر کے اپنے رب کے پاس پہنچ جائے گی۔ مراد عالم برزخ میں پہنچنا ہے، جو کافروں کی روحوں کے لئے بمنزلہ حوالات

(قید خانہ) ہے۔

۳۲۔ اب اس شخص کی عملی زندگی کی تصویر پیش کی جارہی ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہورہا ہے تو اپنے ساتھ کیا لے کر رخصت ہورہا ہے۔ روزِ جزا کو اس نے سچ نہیں مانا تھا اور نہ اللہ کی عبادت سے اسے کوئی سروکار رہا۔ چنانچہ اس نے نماز جیسے اہم ترین فریضہ سے بے اعتنائی برتی۔

واضح ہوا کہ روزِ جزا پر ایمان لانے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھے، اور قرآن کافروں کا یہ حال بتاتا ہے کہ وہ نماز کے تارک ہوتے ہیں لیکن موجودہ دور میں مسلمانوں کی بڑی تعداد بے نمازی ہے۔ اگر وہ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیں تو چونک جائیں اور نماز کی انہیں توفیق ہو۔

۳۳۔ جھٹلایا آخرت کو اور منہ موڑا اللہ کی عبادت واطاعت سے۔

۳۴۔ یعنی یہ اس کا گھمنڈ ہے جو قبولِ حق سے اسے روک رہا ہے۔ ایسا شخص نصیحت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا، بلکہ اس سے منہ موڑ کر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیتا ہے اور اپنی خوشحالی پر نازاں ہوتا ہے۔

۳۵۔ 'اُولٰی لَکَ' جیسا کہ جوھری نے صراحت کی ہے تہدید اور وعید کا کلمہ ہے۔ اصل میں یہ 'وَلِیَ' سے ہے جس کے معنی قریب ہونے کے ہیں۔ اصمعی کہتے ہیں اس کے معنی ہیں ہلاک کرنے والی چیز قریب ہوگئی۔ یعنی مصیبت نازل ہوگئی۔ (الصحاح للجوھری ج ۶ ص ۲۵۳۰)

ان دو آیتوں میں اس شخص کی اس روش پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ کلمہ چار مرتبہ آیا ہے جو اس بات کو واضح کررہا ہے کہ ایسے شخص کے لئے ہلاکت پر ہلاکت ہے۔ دنیا میں بھی ہلاکت اور عالم برزخ میں بھی ہلاکت، پھر میدان حشر میں بھی ہلاکت اور انجام کار دوزخ، جہاں ہمیشہ کے لئے ہلاکت میں رہنا ہے۔

۳۶۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ مؤمنون نوٹ ۱۰۲۔

۳۷۔ یعنی انسان کا گھمنڈ اور دوسری زندگی سے اس کا انکار کس بنیاد پر ہے؟ وہ اپنی اس حقیقت کو بھول جاتا ہے کہ وہ منی کی ایک حقیر بوند تھا، جسے رحم میں ڈالنے کا عمل انسان نے کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق مختلف مراحل سے گزار کر کی۔

۳۸۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ حج نوٹ ۹۔ اور سورۂ مؤمنون نوٹ ۱۴۔

۳۹۔ یعنی خون کے تھکے کو جسمِ انسانی کی شکل دی اور پھر اس کے نوک پلک درست کئے۔

۴۰۔ یعنی مزید برآں۔

۴۱۔ جوڑا بنانا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اس کے خالق نے اس کو حکمت و مصلحت اور ایک منصوبہ کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

مزید تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ نبا نوٹ ۶۔

۴۲۔ یعنی جس کے عجائباتِ قدرت کی شان یہ ہو اس کے لئے مُردوں کو زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟

۷۶۔الانسان

نام پہلی آیت میں انسان کی اس حالت کا ذکر ہوا ہے جب وہ کچھ بھی نہ تھا۔اس مناسبت سے اس سورۂ کا نام **'الانسان'** ہے۔اس کا دوسرا معروف نام 'الدھر' (زمانہ) بھی ہے، اس مناسبت سے کہ یہ لفظ پہلی آیت میں آیا ہے۔جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں سورتوں کے نام موضوع کے لحاظ سے نہیں ہوتے بلکہ خاص الفاظ (Significant Words) کی مناسبت سے شناخت کے لئے ہوتے ہیں۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ اول میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون جزا و سزا ہے لیکن جزاء (انعام) کا پہلو غالب ہے، تاکہ ان ابدی انعامات کو حاصل کرنے کی لوگوں کو ترغیب ہو اور وہ نیک کردار بنیں۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۳ میں انسان کی تخلیق اور اس کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۴ میں کافروں کے لئے سخت سزا کا اعلان ہے۔

آیت ۵ تا ۲۲ میں نیک عمل لوگوں کا عظیم الشان صِلہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۲۳ تا ۲۶ میں نبی ﷺ کو صبر، نماز اور تسبیح کی ہدایت کی گئی ہے۔

آیت ۲۷ اور ۲۸ میں ان لوگوں کو، جو دنیا پر فریفتہ ہو کر آخرت کو نظر انداز کرتے ہیں، متنبہ کیا گیا ہے۔

آیت ۲۹ تا ۳۱ میں قرآن کی نصیحت کو قبول کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، تاکہ لوگ اللہ کی رحمت میں داخل ہوں۔لیکن جو لوگ انکار پر مصر رہیں گے انہیں دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

سُوْرَةُ الْاِنْسَانِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③

اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۠ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ④

اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ⑤

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ⑥

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ⑦

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ⑧

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ⑨

اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ⑩

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ⑪

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ⑫

۷۶۔ سُوْرَةُ الْاِنْسَان

آیات: ۳۱

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کیا انسان پر زمانۂ مدید میں ایک وقت ایسا نہیں گزرا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا؟ ۱؎

۲ ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفہ سے پیدا کیا ۲؎، تاکہ اسے آزمائیں۔ چنانچہ ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ۳؎

۳ ہم نے اس کو راہ دکھادی ۴؎۔ چاہے وہ شکرگزار بنے یا ناشکرا۔ ۵؎

۴ کافروں کے لئے ہم نے زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ ۶؎

۵ نیک لوگ ۷؎، ایسی شراب کے جام پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔

۶ یہ ایک چشمہ ہوگا ۸؎، جس سے اللہ کے بندے ۹؎ پئیں گے۔ اور اس کی شاخیں (جہاں چاہیں گے) نکال لیں گے۔ ۱۰؎

۷ یہ لوگ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں ۱۱؎۔ اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔

۸ اور اسکی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ ۱۲؎

۹ ہم تمہیں صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کھلاتے ہیں۔ نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ۱۳؎

۱۰ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک ایسے دن کا خوف رکھتے ہیں جو ترش رو اور نہایت سخت ہوگا۔ ۱۴؎

۱۱ تو اللہ نے ان کو اس دن کی مصیبت سے بچالیا۔ اور ان کو تازگی اور سرور بخشا۔ ۱۵؎

۱۲ اور ان کے صبر کے بدلہ میں انہیں جنت اور ریشمی لباس عطاء کیا، ۱۶؎

۱۔ انسان نے زمین پر جب سے آنکھیں کھولی ہیں، وہ عروج اور کمالات کے جوہر دکھا رہا ہے۔ گویا زمین پر انسانی آبادی کا یہ دور گزشتہ ادوار کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور انسان اپنی اس دنیوی ترقی پر فخر کرتا ہے۔ لیکن اپنے ماضی پر غور نہیں کرتا کہ وہ آغاز میں کیا تھا اور اس کے خالق نے اسے کیا بنا دیا۔ ایک وقت وہ تھا جب انسان سڑی ہوئی مٹی میں ڈھل رہا تھا، اور سڑی ہوئی مٹی کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ہے۔ پھر آدم کی تخلیق کے بعد اس کی نسل کا سلسلہ نطفہ سے، جو پانی کی نہایت حقیر بوند ہوتی ہے چلایا گیا ہے۔ ہر شخص پر ایک وقت گزر چکا ہوتا ہے، جب وہ ایسی چیز تھا جو نہ وقیع تھی اور نہ قابلِ ذکر۔ کیا انسان کا یہ ماضی اور اس کی یہ حقیقت اس بات کی یاددہانی نہیں ہے کہ اس کے رب نے اپنے کرشمۂ قدرت سے ذرہ کو آفتاب بنا دیا ہے؟

۲۔ نطفہ بجائے خود مخلوط ہوتا ہے، یعنی اس میں کئی قسم کی رطوبتیں ہوتی ہیں۔ اور موجودہ فیزیالوجی (Physiology) کی رو سے ایک رطوبت (Liquid) وہ ہوتی ہے، جس میں جرثومۂ حیات (Spermatozoon) ہوتے ہیں۔ اور یہ جرثومہ خصیوں سے نکل کر کسیۂ منی (Seminal Vesicles) میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اور تیسری رطوبت پروسٹیٹ گلینڈ (Prostate gland) کی ہوتی ہے، جو اس میں خاص بو پیدا کرتی ہے۔ اور چوتھی رطوبت وہ غدود (glands) پیدا کرتے ہیں، جو پیشاب کی نالی کے پاس ہوتے ہیں اور اسے لعابدار بناتے ہیں۔ نطفہ ان سب رطوبتوں سے مخلوط ہوتا ہے۔ پھر جب یہ نطفہ رحم میں بیضہ (Ovum) سے مل جاتا ہے تو بیضہ بارآور (Fertilized) ہو جاتا ہے۔ یعنی حمل قرار پاتا ہے۔ اس طرح انسان کی پیدائش کا آغاز مرد کے مادۂ تولید (نطفہ) کے عورت کے مادۂ تولید (بیضہ) سے مخلوط ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

۳۔ یعنی انسان کی تخلیق اس لئے ہوئی ہے تاکہ اس کا امتحان لیا جائے۔ اسی لئے اس کو سماعت اور بصارت کی قوتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان قوتوں نے اسے سوجھ بوجھ رکھنے والی مخلوق بنا دیا ہے اور اسے یہ شعور بخشا ہے کہ وہ خیر و شر میں تمیز کرے۔

۴۔ یعنی ہم نے اس پر ہدایت کی راہ واضح کر دی۔ فطرت کی رہنمائی کے ذریعہ بھی، آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ بھی اور سلسلۂ وحی و رسالت کے ذریعہ بھی۔

۵۔ اب اسے اختیار ہے کہ اللہ کا شکرگزار بندہ بنے یا ناشکرا اور کافر بنے۔ جب انسان کا امتحان لینا مقصود قرار پایا، تو اس کو اپنی مرضی کے مطابق شاکر یا کافر بننے کی آزادی بھی بخشی گئی۔

۶۔ کافر بننے کا اختیار دیا تو گیا ہے لیکن جو لوگ کافر بنیں گے وہ یاد رکھیں کہ وہ امتحان میں ناکام ہوئے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کے پیچھے چل کر غلط راہ کا انتخاب کیا، اس لئے آخرت میں وہ سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ وہ زنجیروں میں جکڑ دئے جائیں گے، طوق ان کے گلے میں پڑے ہوں گے اور وہ بھڑکتی آگ میں جھونک دئے جائیں گے۔ کیسی دردناک سزائیں ہیں اللہ کی ہدایت سے منہ موڑنے والوں کے لئے!

۷۔ 'ابرار' بَرّ کی جمع ہے اور یہ لفظ بِرّ سے ہے، جس کے معنی صدق و وفا اور اطاعت شعاری کے ہیں۔ جس شخص کی یہ صفت ہو اس کو اردو میں نیک کہتے ہیں۔ آیت کا سیاق و سباق (Context) دلیل ہے کہ ابرار سے مراد اللہ کے وہ بندے ہیں جو اس کے شکرگزار اور اطاعت شعار بن کر رہے اور جنہوں نے آخرت کو مقصد بنا کر نیک عملی کی زندگی بسر کی۔

۸۔ کافور جنت میں ایک چشمہ ہوگا، جس کو دنیا کے کافور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس کا تصور اس طرح قائم ہوتا ہے کہ وہ صفائی اور ٹھنڈک میں کافور کی طرح ہوگا نیز اس کی خوشبو اور اس کا ذائقہ ایسا ہوگا کہ پینے والے اس سے سرور حاصل کریں گے۔ اس کی تھوڑی سی مقدار ہی شراب کو لذت بخش بنانے کے لئے کافی ہوگی۔ اس لئے شراب کے جام میں اس کی آمیزش ہوگی۔

۹۔ عباد سے مراد اللہ کے مخلص بندے ہیں۔

۱۰؎ یعنی یہ ضروری نہیں ہوگا کہ وہ اس چشمہ پر آئیں اور پھر اس سے بہرہ مند ہوں، بلکہ یہ بات ان کے اختیار میں ہوگی کہ وہ جہاں چاہیں اس چشمہ کو جاری کر دیں۔

۱۱؎ نذر یہ ہے کہ آدمی اپنے اوپر اللہ کے تقرب کا کوئی کام واجب کر لے۔ مثلاً کسی نعمت کے حاصل ہو جانے پر یہ عہد کرے کہ میں اتنے روزے رکھوں گا۔ یا منت مانے کہ اگر مرض سے شفایاب ہوا تو اتنا مال صدقہ کروں گا۔ ایسی نذر کا پورا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ جو عہد اللہ کے ساتھ کیا گیا وہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کو پورا کر کے ہی آدمی اپنے صداقت شعار اور نیک ہونے کا ثبوت دے سکتا ہے۔

اسلام نے نذر ماننے کی ترغیب نہیں دی مغنی میں ہے:

وَلِاَنَّ النَّذْرَ لَوْ كَانَ مُسْتَحَبًّا لَفَعَلَهُ النَّبِيُّ ﷺ وَاَفَاضِلُ اَصْحَابِهِ۔ (المغنی ج ۹ ص ۱)

''اور اس لئے کہ نذر اگر مستحب ہوتی تو نبی ﷺ اور جلیل القدر صحابہ اس پر عمل کرتے۔''

اور فقہ السنہ میں ہے:

وَالْاِسْلَامُ وَاِنْ كَانَ قَدْ شَرَعَهُ اِلَّا اَنَّهُ لَا يَسْتَحِبُّهُ، فَعَنْ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ النَّذْرِ وَقَالَ! اِنَّهُ لَا يَاْتِيْ بِخَيْرٍ وَّاِنَّمَا يُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِيْلِ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ۔ (فقہ السنہ للسید سابق ج ۳ ص ۳۵)

''اسلام نے اگرچہ نذر کو مشروع (جائز) قرار دیا ہے لیکن یہ مستحب نہیں ہے۔ ابن عمر سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا وہ کسی خیر کا موجب نہیں البتہ اس کے ذریعہ کچھ مال بخیل سے نکلوایا جاتا ہے۔''

اور یہ بھی واقعہ ہے کہ شرعی احکام کی تکمیل کے بعد نذر کے لئے کم ہی گنجائش رہ گئی ہے۔ کیونکہ ان احکام کی پابندی لازم اور مقدم ہے۔ نیز نفل نماز اور صدقات بھی بلا تحدید ادا کئے جا سکتے ہیں۔ پھر نذر کی صورت میں اپنے اوپر کچھ چیزیں واجب کرنا اپنے کو مشکلات ہی میں ڈالنا ہے۔ اس لئے اسلام نے نذر ماننے کی ترغیب نہیں دی، البتہ اگر کوئی شخص نذر مان لے تو اس کو پورا کرنے کا تاکیدی حکم دیا ہے۔

واضح رہے کہ نذر عبادت ہے، اس لئے اللہ ہی کیلئے نذر مانی جا سکتی ہے۔ کسی اور کے نام کی نذر (منت) ماننا خواہ وہ دیوی دیوتا ہو یا پیر اور ولی، شرک ہے۔

۱۲؎ یعنی اللہ کی محبت میں وہ ناداروں کی مدد کرتے ہیں۔ حاجتمندوں کو کھانا کھلانا ان کی اولین ضرورت کو پورا کرنا ہے اس لئے اس کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ورنہ ان کو کپڑے پہنانا، ان کے علاج معالجہ اور بے گھر ہونے کی صورت میں ان کی رہائش کا انتظام کرنا سب نیکی کے کام ہیں اور ضروری بھی۔

اس زمانہ میں قیدیوں کے لئے باقاعدہ قید خانے نہیں ہوتے تھے، جہاں کھانے کا بھی انتظام ہو اس لئے ان کو کھانا کھلانے کی خاص طور سے ترغیب دی گئی۔ قطعِ نظر اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اور جنگی قیدی ہوں یا کسی جرم میں گرفتار کر لئے گئے ہوں۔ اخلاق و انسانیت کا تقاضہ ہے کہ ان کی بھوک کی تکلیف کو دور کیا جائے اور ان کے لئے کھانا مہیا کیا جائے۔

۱۳؎ یعنی وہ ان محتاجوں کی مدد اس لئے نہیں کرتے کہ ان سے کسی قسم کا بدلہ ملے اور نہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو اور ان کا شکریہ ادا کیا جائے۔ بلکہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر وہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لئے ان کی امداد و اعانت کرتے ہیں۔ اور صدقہ حقیقۃً وہی ہے جو خالصۃً اللہ کی خوشنودی کے لئے دیا جائے۔ نہ تو اس کا بدلہ چاہا جائے اور نہ نام و نمود مقصود ہو۔ جہاں ریا کا شائبہ آ گیا وہاں اجر جاتا رہا۔

۱۴؎ یعنی جو نیکی بھی ہم کرتے ہیں آخرت کو مقصود بنا کر کرتے ہیں۔ قیامت کے دن کی مصیبت کے تصور سے ہم لرزاں رہتے ہیں اور اس دن کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کو ہم اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

قیامت کا دن ترش رو ہوگا، یعنی وہ دن ایسا ہوگا کہ ہر مجرم کو ترش رو بنا دے گا۔

۱۵۔ یعنی اللہ ان لوگوں، کو جن کے اوصاف اوپر بیان ہوئے قیامت کے دن کی آفت سے محفوظ رکھے گا اور انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بلکہ ان کے چہرے تروتازہ ہوں گے اور ان کے دل شاداں وفرحاں کہ وہ دنیا کے امتحان سے کامیاب نکل آئے۔

۱۶۔ واضح ہوا کہ جنت مفت میں ملنے والی چیز نہیں ہے بلکہ صبر کے بدلہ میں ملے گی۔ شرعی احکام کی پابندی اور نیکی اور تقویٰ کی زندگی یقیناً صبر آزما ہوتی ہے لیکن اس امتحانی مرحلہ سے کامیابی کے ساتھ گزرنے والوں کے لئے ابدی جنت کے دروازے کھلتے ہیں۔

جنت کی ہر چیز اعلیٰ درجہ کی ہوگی۔ لباس بھی نہایت نفیس اور خالص ریشم کے ہوں گے۔ جنت کی نعمتوں میں جو آگے بیان ہوئی ہیں لباس کا ذکر سب سے پہلے ہوا۔ گویا سب سے پہلا اعزاز جو اہلِ جنت کو عطا کیا جائے گا وہ لباسِ فاخرہ ہوگا۔

مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ﴿۱۳﴾

۱۳ وہاں وہ تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ۱۷۔ نہ انہیں دھوپ کی حدت محسوس ہوگی اور نہ سردی کی شدت۔ ۱۸۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾

۱۴ اس کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے ۱۹۔ اور اس کے خوشے جھک کر لٹک رہے ہوں گے۔ ۲۰۔

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۙ ﴿۱۵﴾

۱۵ ان کے آگے چاندی کے برتن ۲۱، اور شیشے کے گلاس گردش میں ہوں گے،

قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

۱۶ شیشے بھی وہ جو چاندی کے ہوں گے ۲۲۔ اور ان کے پیمانے وہ خود مقرر کریں گے۔ ۲۳۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۚ ﴿۱۷﴾

۱۷ ان کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوگی۔

عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴿۱۸﴾

۱۸ یہ ایک چشمہ ہوگا ۲۴، جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔ ۲۵۔

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾

۱۹ ان کے پاس ایسے لڑکے گردش میں ہوں گے جو ہمیشہ اسی سن کے رہیں گے ۲۶۔ تم ان کو دیکھو تو خیال کرو یہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ ۲۷۔

وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

۲۰ وہاں جدھر بھی دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور عظیم بادشاہی دکھائی دے گی۔ ۲۸۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

۲۱ ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز اور اطلس کے کپڑے ہوں گے ۲۹۔ ان کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے ۳۰۔ اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ مشروب پلائے گا۔ ۳۱۔

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

۲۲ یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری سعی مقبول ہوئی۔ ۳۲۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۚ ﴿۲۳﴾

۲۳ (اے نبی!) ۳۳۔ ہم نے تم پر قرآن بتدریج نازل کیا ہے۔ ۳۴۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿۲۴﴾

۲۴ لہٰذا تم اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو ۳۵۔ اور ان میں سے کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات نہ مانو۔ ۳۶۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۲۵﴾

۲۵ اپنے رب کے نام کا ذکر کرو صبح و شام۔ ۳۷۔

۱۷۔ ان آیتوں میں جنت کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ کیسی شاندار ہوگی وہ جنت اور کس شان سے رہیں گے اس میں جنتی! جنت کی یہ جھلک قرآن ہی نے دکھائی ہے اور یہ اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہ دنیا ہی میں جنت کی سیر کراتی ہے۔

اہلِ جنت تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اور یہ تعبیر ہے ان کے شاہانہ انداز سے جنت میں رہنے کی۔

۱۸۔ یعنی جنت کی فضا بالکل خوشگوار ہوگی۔ سردی اور گرمی کی کوئی تکلیف وہاں محسوس نہ ہوگی۔ ہر چیز کمال درجہ اعتدال پر ہوگی۔

۱۹۔ یعنی جنت کے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے۔ اس سے جنت کے پرفضا اور راحت بخش ہونے کا تصور قائم ہوتا ہے۔

۲۰۔ جنت کے درختوں کے خوشے اس طرح لٹک رہے ہوں گے کہ ان کو بہ آسانی توڑا جا سکے۔ ان کے پھل حاصل کرنے کے لئے کوئی زحمت کرنا نہیں ہوگی۔

۲۱۔ سورۂ زخرف آیت ۷۱ میں بیان ہوا ہے کہ جنت میں سونے کے برتن ہوں گے اور یہاں چاندی کے برتنوں کا ذکر ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ جنت میں چاندی کے بھی برتن ہوں گے اور سونے کے بھی۔

واضح رہے کہ دنیا میں چاندی اور سونے کے برتنوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ یہ سامانِ عیش جنت ہی کے لئے موزوں ہے۔

۲۲۔ پیالے شیشے کے ہوں گے اور شیشہ وہ جو چاندی کا ہوگا۔ بالفاظ دیگر ایسی چاندی کے پیالے ہوں گے جو شیشہ کی طرح شفاف (Transparent) ہوگی۔ یہ جنت کی چاندی کی خصوصیت ہوگی دنیا میں ایسی چاندی کا وجود نہیں ہے۔ اور جس چیز کا وجود دنیا میں نہیں ہے اس کا تصور دے کر قرآن نے اپنے پیروؤں کو کیسی روحانی پرواز بخشی ہے!

۲۳۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح سمجھ میں آتا ہے کہ جنت کے گلاس ایڈجسٹ کرنے کے قابل (Adjustable) ہوں گے۔ وہ ان کا جو پیمانہ چاہیں گے مقرر کریں گے تاکہ وہ اپنی مطلوبہ مقدار میں مشروب حاصل کر سکیں۔

۲۴۔ زنجبیل (سونٹھ) ایک خوشبودار اور حرارت پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اس سے جنت کے چشمہ کا ایک ہلکا سا تصور قائم ہوتا ہے۔ ورنہ دنیا کی سونٹھ پر جنت کی زنجبیل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ زنجبیل کی آمیزش سے جنت کی شراب کیف آور بنے گی۔

۲۵۔ سلسبیل کے لغوی معنی ہیں آسانی سے حلق میں اُترنے والا اور رواں، دواں۔ زنجبیل کے چشمہ کا یہ نام اس کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کسی طرح کی تلخی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کا پانی بڑی آسانی سے حلق سے اترے گا۔

جنت کی دوسری نعمتوں کی طرح اس کے اس چشمہ کی خصوصیت کا بھی صحیح اندازہ ہم دنیا میں نہیں قائم کر سکتے، جن لوگوں کو جنت کی سعادت حاصل ہوگی وہی اس کی خصوصیات سے آشنا ہو سکیں گے۔

۲۶۔ اس کی تشریح سورۂ طور نوٹ ۲۲ میں گزر چکی۔

۲۷۔ یعنی یہ لڑکے اپنے جمال اور اپنی نظامت کا ایسا منظر پیش کریں گے کہ گویا وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔

۲۸۔ دنیا کی طرح جنت میں نپی تلی نعمتیں نہیں ملیں گے، بلکہ ہر شخص وہاں نعمتوں سے مالا مال ہوگا اور شاہانہ انداز کی شان و شوکت اسے حاصل ہوگی اور جنت کا چپہ چپہ اسے عزت و سرفرازی بخشنے والا ہوگا۔

۲۹۔ اس کی تشریح سورۂ کہف نوٹ ۴۸ میں گزر چکی۔

۳۰۔ سورۂ کہف آیت ۳۱ میں بیان ہوا ہے کہ ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور یہاں چاندی کے کنگن پہنائے جانے کا ذکر ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ اہل جنت کو دونوں ہی قسم کے کنگن پہنائے جائیں گے چاندی کے بھی اور سونے کے بھی۔

۳۱۔ یہ گویا اللہ کا فضلِ خاص ہوگا کہ وہ ان شرابوں کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا، ایک خاص قسم کا مشروب جو نہایت ہی پاکیزہ ہوگا انہیں پلائے گا۔ اس کی لذت اور اس کا کیف کیا ہوگا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

۳۲۔ یعنی یہ صلہ اور انعام ہے ان اعمال کا جو دنیا میں تم نے انجام دئے۔ اور تمہاری سعی تمہارے رب کی نظر میں قابل قدر ٹھہری اور مقبول بارگاہ ہوئی۔ یہ مبارکباد کا بہت بڑا اعزاز و اکرام ہوگا جس سے اہل جنت کو نوازا جائے گا۔

۳۳۔ اب خطاب کا رخ نبی ﷺ کی طرف ہو رہا ہے اور آپ کو ہدایات دی جا رہی ہیں اور آپ کے توسط سے آپ کے پیروؤں کو۔

۳۴۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورہ بنی اسرائیل نوٹ ۱۴۰۔

۳۵۔ یعنی اللہ ان کافروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے اس کا صبر کے ساتھ انتظار کرو۔

۳۶۔ آثم (گنہگار) یعنی ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنے والا اور کفور (ناشکرا) یعنی اللہ کی نعمتوں کی قدر نہ کرنے والا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص گناہ کی زندگی گزار رہا ہو، وہ تم سے گناہ کے کام کرنے کے لئے ہی کہے گا اور جو اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کرنے والا ہو، وہ انکارِ نعمت اور کفر ہی کی باتیں کرے گا۔ تو ایسے کسی بھی شخص کی باتوں میں تم مت آؤ اور اس کا دباؤ قبول نہ کرو۔

اس آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے لیکن اصل مخاطب آپ کے پیرو ہیں۔

۳۷۔ صبح و شام اللہ کا نام یاد کرنے کا حکم عمومیت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ کی حمد و تسبیح کے کلمات صبح و شام دل کو حاضر رکھ کر زبان سے ادا کرتے رہو۔ اس حکم کی تعمیل کی بہترین صورت صبح و شام کی نمازیں قرار پائیں۔

یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب
کی طرف جانے کی راہ اختیار کر لے۔ (القرآن)

وَّمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿۲۶﴾

۲۶ رات کو بھی اس کے حضور سجدہ کرو ۳۸؎۔ اور رات کے طویل حصہ میں اس کی تسبیح کرو۔ ۳۹؎

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾

۲۷ یہ لوگ جلد حاصل ہونے والی دنیا سے محبت رکھتے ہیں۔ اور ایک بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ ۴۰؎

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا ﴿۲۸﴾

۲۸ ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں۔ اور ہم جب چاہیں ان کی صورتیں بدل دیں۔ ۴۱؎

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۲۹﴾

۲۹ یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کی راہ اختیار کر لے۔ ۴۲؎

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۳۰﴾

۳۰ اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک کہ اللہ نہ چاہے ۴۳؎۔ یقیناً اللہ علم والا حکمت والا ہے۔

يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۳۱﴾

۳۱ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے ۴۴؎۔ اور ظالموں کے لئے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۴۵؎

۳۸۔ سجدہ نماز کا اہم رکن ہے، اس لئے نماز کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات میں بھی نماز پڑھو۔

۳۹۔ آغاز میں نبی ﷺ کو رات کے طویل حصہ میں اللہ کی تسبیح کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد سورۂ مزمل میں رات کا بڑا حصہ نماز میں گزارنے کا حکم دیا گیا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے سورۂ مزمل نوٹ ۲۔ تا ۴۔

۴۰۔ یعنی ان کافروں کو دنیا کا مفاد اتنا عزیز ہے کہ ان کو قیامت کے دن کی کوئی پرواہ نہیں، حالانکہ وہ دن بڑا سخت ہوگا۔ ہر مجرم اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوگا اور اپنی نجات کے لئے سخت پریشان ہوگا۔

۴۱۔ یعنی جب ہم ہی نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں، تو ہم اگر چاہیں تو ان کی صورتیں مسخ بھی کر سکتے ہیں۔ پھر وہ اپنے رب کو بھول کر اپنی موجودہ خلقت پر نازاں کیوں ہیں اور اس سے ڈرتے کیوں نہیں؟

اس موقع پر سورۂ یٰس آیت ۷۷ اور نوٹ ۷۲۔ بھی پیش نظر رہے۔

۴۲۔ یعنی قرآن سرتا سر نصیحت ہے اور اس نصیحت کو قبول کر کے آدمی اپنے رب تک پہنچنے کی راہ اختیار کر سکتا ہے۔

۴۳۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ تکویر نوٹ ۳۰۔

۴۴۔ یعنی اپنے کس بندے کو رحمت میں داخل کیا جائے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم اور اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق کرتا ہے۔

۴۵۔ ظالمین سے مراد توحید اور آخرت کا انکار کرنے والے لوگ ہیں، جن کی زندگیاں اس انکار کے نتیجہ میں بالکل غلط ہو کر رہ گئیں اور وہ گمراہ ہوئے۔ ایسے لوگوں کو دردناک سزا دینا اللہ کی حکمت اور اس کے عدل کا تقاضہ ہے، اس لئے اس نے ان کے لئے جہنم تیار کر رکھی ہے۔

سورۂ
المرسلات

۷۷۔ المُرسَلٰت

نام پہلی آیت میں مُرسَلات (ہواؤں) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام 'المرسلات' ہے

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے آخری حصہ میں نازل ہوئی ہوگی جب کفارِ مکہ شدت سے روزِ جزا کو جھٹلا رہے تھے۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوتِ اسلامی کے خلاف چال چلنے لگے تھے۔

بخاری کی حدیث ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ہم منیٰ کے غار میں تھے اور سورۂ مرسلات نازل ہوئی۔آپ اسے تلاوت فرما رہے تھے اور ہم اسے آپ کی زبان سے سیکھ رہے تھے۔ (بخاری کتاب التفسیر)

مرکزی مضمون بدلہ کے دن کا انکار کرنے والوں کو، ان کے بُرے انجام سے خبردار کرنا۔اور اللہ سے ڈرنے والوں کے حسن انجام کو پیش کرنا، تاکہ منکرین ہوش میں آئیں اور اپنے مستقبل کو سنوارنے کی فکر کریں۔

اس سورہ میں منکرین کے لئے اِنذار (تنبیہ) کا پہلو غالب ہے، جب کہ سابق سورہ (الانسان) میں نیکوکاروں کے لئے خوشخبری کا پہلو غالب ہے۔

نظمِ کلام آیت ۱ تا ۷ میں تیز ہواؤں کو قیامت کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۸ تا ۱۵ میں قیامت کی ہولناک تصویر پیش کی گئی ہے۔

آیت ۱۶ تا ۲۸ میں یومِ جزا کی تائید میں شواہد پیش کرتے ہوئے اس کے حق ہونے پر دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

آیت ۲۹ تا ۴۰ میں جھٹلانے والوں کو قیامت کے دن جن حالات سے سابقہ پیش آئے گا اس کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

آیت ۴۱ تا ۴۴ میں متقیوں کے حسنِ جزا کی تصویر پیش کی گئی ہے۔

آیت ۴۵ تا ۵۰ میں جھٹلانے والوں کی مجرمانہ روش پر انہیں سخت تنبیہ کی گئی ہے۔

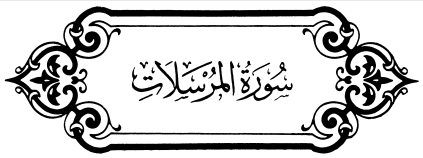

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴿١﴾

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ﴿٢﴾

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ﴿٣﴾

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ﴿٤﴾

فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ﴿٥﴾

عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴿٦﴾

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ﴿٧﴾

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ﴿٨﴾

وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ﴿٩﴾

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴿١٠﴾

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ﴿١١﴾

لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ﴿١٢﴾

لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴿١٣﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ﴿١٤﴾

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٥﴾

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦﴾

ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٧﴾

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٨﴾

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٩﴾

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٢٠﴾

فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿٢١﴾

۷۷۔ سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

آیات: ۵۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

[۱] قسم ہے ان ہواؤں کی جو لگا تار بھیجی جاتی ہیں، ۱۔

[۲] پھر تندو تیز چلنے لگتی ہیں، ۲۔

[۳] اور جو بادلوں کو پھیلاتی ہیں، ۳۔

[۴] پھر (ان کو) الگ الگ کرتی ہیں، ۴۔

[۵] پھر (دلوں میں) یاددہانی (کی بات) ڈالتی ہیں، ۵۔

[۶] حجت قائم کرنے یا خبردار کرنے کے لئے، ۶۔

[۷] جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ ضرور واقع ہوگی۔ ۷۔

[۸] پھر جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، ۸۔

[۹] اور آسمان پھٹ جائے گا، ۹۔

[۱۰] اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردئے جائیں گے، ۱۰۔

[۱۱] اور جب رسولوں کے لئے وقت مقرر ہوگا۔ ۱۱۔

[۱۲] اس میں کس دن کے لئے تاخیر ہو رہی ہے۔

[۱۳] فیصلہ کے دن کے لئے۔ ۱۲۔

[۱۴] اور تمہیں کیا معلوم کہ فیصلہ کا دن کیا ہے؟ ۱۳۔

[۱۵] تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔ ۱۴۔

[۱۶] کیا ہم نے اگلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ۱۵۔

[۱۷] پھر بعد والوں کو، ان کے پیچھے ہلاک کرتے رہے۔ ۱۶۔

[۱۸] مجرموں کے ساتھ ہم ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ ۱۷۔

[۱۹] تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔ ۱۸۔

[۲۰] کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ ۱۹۔

[۲۱] اور اسے ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔ ۲۰۔

ا۔ قسم یہاں شہادت (گواہی) کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ ہوائیں جن کی قسم کھائی گئی ہے، روزِ جزاء کی تائید کرتی ہیں، جس سے قرآن خبردار کر رہا ہے۔

ہوائیں یونہی نہیں چلتیں، بلکہ ان کو چلایا جاتا ہے اور ان کی وہ کیفیت جب وہ لگاتار چلتی ہیں اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کو اسی ہستی نے، جس کا ان پر کنٹرول ہے ایک خاص مقصد سے بھیجا ہے۔ اور وہ ہے بارش۔

۲۔ یعنی پھر ان ہواؤں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور کبھی وہ آندھی اور کبھی طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

۳۔ ہوائیں سمندر سے اٹھنے والے بادلوں کو فضا میں اس طرح پھیلاتی ہیں کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں میل کی دوری پر پہنچ جاتے ہیں۔

۴۔ ہوائیں بادلوں کو الگ الگ کر دیتی ہیں۔ یعنی ان کا ایک حصہ ایک خطۂ زمین کی طرف لے جاتی ہیں، تو ان کا دوسرا حصہ دوسرے خطۂ زمین کی طرف، تاکہ اس منصوبہ کے مطابق بارش ہو، جو ہواؤں کو چلانے والی ہستی نے بنایا ہے۔

۵۔ ان ہواؤں کی حرکات اور کیفیات دلوں کو جگاتی اور ضمیر کو جھنجھوڑتی ہیں اور اپنے ربّ حقیقی کی خشیت پیدا کرتی ہیں۔ جب ہوائیں آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، تو ہر شخص کو اگر اس کا ضمیر بالکل مردہ نہ ہو گیا ہو خدا یاد آجاتا ہے۔ بجلی کی کڑک اور چمک اللہ کا خوف پیدا کرتی ہے کہ وہ عذاب کا کوڑا برسا سکتا ہے۔ دوسری طرف ہوائیں بادلوں کو کھینچ کر لاتی ہیں اور بارانِ رحمت کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنی خاموش زبان میں اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ ایک زبردست ہستی ہے، جو سخت سزا دینے پر قادر ہے۔ اس لئے اس کی نافرمانی کرنا اس کے عذاب کو دعوت دینا ہے اور اس کی فرمانبرداری کر کے ہی انسان اس کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے جزا و سزا کے اس تصور کی تائید ہوتی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔

یہ ہوائیں رب العٰلمین کی قدرت اور حکمت کا نشان بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ ہواؤں کا یہ عالمگیر نظام اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کائنات بے خدا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا ایک خدا ہے اور وہ ایک نظام میں جکڑی ہوئی ہے۔ ہوائیں بھی اس نظام ہی کے تحت ہیں۔ یہ نظام خدا کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی قدرت سے ہرگز یہ بعید نہیں کہ وہ قیامت برپا کرے اور انسان کو دوبارہ اٹھائے۔ اور اس کی حکمت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ انصاف کا دن قائم کرے۔ اور انسان اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔ ورنہ یہ زندگی بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے اور زندگی کا بے مقصد ہونا خلافِ حکمت ہے۔

مختصر یہ کہ تیز چلنے والی یہ ہوائیں اپنے گوناگوں اور عجیب وغریب تصرفات سے انسان کو اپنے رب کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ایک عزیز (زبردست) اور حکیم ہستی کا احساس اس میں پیدا کرتی ہیں اور اسی احساس کے نتیجہ میں جزا و سزا کا تصور ابھرتا ہے۔

۶۔ یہ ہوائیں اپنی حرکات و کیفیات سے اللہ کی وحدانیت، اس کی ربوبیت، اس کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کے مدبر کائنات ہونے کی شہادت دیتی ہیں اور ان کے تھپیڑے سوئی ہوئی انسانیت کو جگاتے ہیں اور ان کی سرسراہٹ قیامت کا الارم بجاتی ہیں۔ گویا ہوائیں اللہ کی وحدانیت کا گیت گاتے ہوئے اور انسان کو احساسِ ذمہ داری کا سبق دیتے ہوئے گزرتی ہیں۔ اس طرح ان ہواؤں کے ذریعہ لوگوں پر اللہ کی حجت بھی قائم ہو جاتی ہے اور ان کو چونکانے اور خبردار کرنے کی خدمت بھی وہ انجام دیتی ہیں۔

ہواؤں کے چلنے میں توحید و آخرت کی جو نشانیاں ہیں ان کی طرف قرآن میں متعدد مقامات پر متوجہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے سورۂ ذاریات آیت ۱ تا ۶۔

۷۔ یہ وہ بات ہے جس پر ہواؤں کی قسم کھائی گئی ہے۔ وعدہ قیامت کے دن کا کیا جا رہا ہے کہ اس روز انسان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، تاکہ وہ اپنے

عمل کی جزا یا سزا پائے۔ یہ وعدہ لازماً پورا ہوگا اور وہ باتیں حقیقتِ واقعہ بن کر سامنے آئیں گی، جن کے واقع ہونے کی خبر قرآن دے رہا ہے۔

۸۔ اب قیامت کے کچھ احوال بیان کئے جا رہے ہیں۔

جب پہلا صور پھونکا جائے گا، تو زمین اور آسمان دونوں زبردست حادثہ سے دوچار ہو جائیں گے۔ بے شمار ستارے جو آج روشن ہیں، اس روز ان کی روشنی بالکل ختم ہو جائے گی۔ سورۂ تکویر میں فرمایا:

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ

''جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔''

وہ وقت کیسا ہوگا جب پورے عالم میں تاریکی چھا جائے گی۔

۹۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ انشقاق نوٹ ۱۔

۱۰۔ تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ کہف نوٹ ۶۲۔

۱۱۔ اب اس وقت کا ذکر ہو رہا ہے جب دوسرا صور پھونکا جائے گا اور تمام انسانوں کو زندہ کر کے میدانِ حشر میں لایا جائے گا۔

اس روز عدالت برپا ہوگی اور رسولوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اپنی امتوں کے بارے میں گواہی دیں۔

۱۲۔ یعنی جانتے ہو کہ یہ تمام کام کس دن کے لئے اٹھا رکھے گئے ہیں؟ فیصلہ کے دن کے لئے۔ یعنی آج دنیا میں عدالتِ الٰہی برپا نہیں کی جا رہی ہے، تو یہ نہ سمجھو کہ کبھی عدالت الٰہی برپا ہوگی ہی نہیں اور مجرم سزا پانے سے چھوٹ جائیں گے۔ نہیں بلکہ عدالتِ الٰہی کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے۔ اس روز ہر ایک کو اپنا حساب دینا ہوگا۔

۱۳۔ یعنی خوب سمجھ لو کہ فیصلہ کا دن بڑا سخت ہوگا۔

۱۴۔ جو لوگ آج روزِ جزا کو جھٹلا رہے ہیں وہ اس روز ہلاکت میں پڑیں گے۔

'ویل' کے معنی ہر قسم کی تباہی کے ہیں۔ لسان العرب میں ہے:

واصل الویل فی اللغة العذاب والهلاک۔ ''لغت میں ویل کے اصل معنی عذاب اور ہلاکت کے ہیں۔''

الویل: الحزن الهلاک والمشقة من العذاب۔ ''ویل کے معنی حزن (غم اور افسوس) ہلاکت اور عذاب کی مشقت کے ہیں۔''

قال سیبویه ویلٌ له وویلاً له ای قبیحا۔ ''سیبویہ کہتے ہیں کہ اس کے لئے ویل ہے یعنی اس کے لئے خرابی ہے۔''

(لسان العرب ج ۱۱ ص ۷۳۸)

قیامت کے دن کو جھٹلانے والے کے لئے 'ویل' ہے کا مطلب یہ ہے کہ روزِ جزا کو جھٹلانے والے نہایت افسوسناک حالت سے دوچار ہوں گے۔ انہیں سخت عذاب بھگتنا ہوگا، وہ ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں گریں گے اور ان کا انجام نہایت بُرا ہوگا۔

یہ آیت اس سورہ میں دس مرتبہ آئی ہے اور یہ اس سورہ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس تکرار (بار بار دہرانے) سے مقصود جھٹلانے والوں کو بار بار انجامِ بد کی طرف متوجہ کرنا ہے، تاکہ وہ چونکیں اور ہوش کے ناخن لیں۔

۱۵۔ مراد قدیم ترین کافر قومیں ہیں۔ مثلاً قومِ نوح، قومِ عاد اور ثمود وغیرہ۔

۱۶۔ یعنی ان کے بعد آنے والی دوسری کافر قوموں کو بھی ہلاک کرتے رہے ہیں۔ مثلاً قومِ لوط، قومِ شعیب اور قومِ فرعون۔

۱۷؎ مجرمین سے مراد کافر اور جھٹلانے والی قومیں ہیں۔ اللہ کی سنت یہی ہے کہ جب کوئی رسول آیا اور اس کی قوم نے اسے جھٹلایا، تو اسے عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا گیا تا کہ رسول کی حقانیت ثابت ہو۔ نیز اس لئے بھی کہ جس قوم پر اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی ہو اور اس کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تو ایسی قوم انسانیت کے لئے ناسور بن جاتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد، کسی قوم کا کفر پر اصرار اللہ کے غضب کا موجب ہے۔

۱۸؎ جب دنیا میں مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچایا گیا، تو قیامت کے دن جو عدل و انصاف کا دن ہوگا کس طرح وہ سزا سے بچ سکیں گے۔

۱۹؎ یعنی معمولی نطفہ سے۔

۲۰؎ یعنی رحم (شکم) میں۔

اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾	۲۲ ایک مقررہ مدت تک، ۲۱۔
فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾	۲۳ تو ہم نے ایک منصوبہ بنایا۔اور ہم کیا ہی خوب منصوبہ بنانے والے ہیں!۲۲۔
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾	۲۴ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾	۲۵ کیا ہم نے زمین کو سمیٹ رکھنے والی نہیں بنایا؟
اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾	۲۶ زندوں اور مُردوں کو، ۲۳۔
وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾	۲۷ اور اس میں اونچے پہاڑ رکھے ۲۴۔اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔۲۵۔
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾	۲۸ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔
اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾	۲۹ چلو اس چیز کی طرف جسے تم جھٹلاتے رہے۔۲۶۔
اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾	۳۰ چلو اس سایہ کی طرف جو تین شاخوں والا ہے، ۲۷۔
لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾	۳۱ جس میں نہ چھاؤں ہے اور نہ وہ شعلوں کی لپٹ سے بچائے گا۔۲۸۔
اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾	۳۲ وہ آگ محل کی طرح (اونچی) چنگاریاں پھینکتی ہوگی۔۲۹۔
كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾	۳۳ گویا وہ زرد، اونٹ ہیں۔۳۰۔
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾	۳۴ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔
هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾	۳۵ یہ وہ دن ہے کہ وہ بول نہ سکیں گے، ۳۱۔
وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾	۳۶ اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کر سکیں۔۳۲۔
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾	۳۷ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔۳۳۔
هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾	۳۸ یہ فیصلہ کا دن ہے۔ہم نے تم کو بھی جمع کر دیا ہے اور تم سے پہلے کے لوگوں کو بھی۔۳۴۔
فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾	۳۹ اگر تم کوئی چال چل سکتے ہو تو میرے مقابلہ میں چل دیکھو۔۳۵۔
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾	۴۰ تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾	۴۱ متقی (اللہ سے ڈرنے والے) سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔۳۶۔
وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾	۴۲ اور اپنی پسند کے میووں میں۔۳۷۔

۲۱۔ مراد حمل کی مدت ہے۔

۲۲۔ یعنی انسان کی تخلیق کا کام ایک خاص منصوبہ کے مطابق انجام پاتا ہے اور وہ باشعور اور بہترین مخلوق بن جاتا ہے۔ یہ منصوبہ بندی اللہ ہی کی ہوتی ہے۔ تو جو ہستی اتنا بہترین منصوبہ بنانے والی اور اتنی عمدہ تدبیر کرنے والی ہے، اس کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جاسکتی ہے کہ اس نے انسان کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور اس کی کوئی غایت نہیں۔

۲۳۔ زمین زندہ انسانوں کو اپنی آغوش میں رہنے بسنے کے لئے جگہ دیتی ہے اور مُردوں کے لئے بھی مدفن بن جاتی ہے۔ اس طرح زمین انسان کو اس کی زندگی میں بھی سمیٹ رکھتی ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی۔

۲۴۔ اونچے پہاڑ بادلوں کو روکتے ہیں جس کی وجہ سے پہاڑی علاقہ میں خوب بارش ہوتی ہے اور دریا بہہ پڑتے ہیں۔

۲۵۔ دریاؤں اور چشموں کو جاری کیا جن سے میٹھا پانی حاصل ہوتا ہے۔

کیا یہ سب نعمتیں اللہ کی ربوبیت کی نشانی نہیں ہیں؟ اور جب اس نے تمہاری ربوبیت (پرورش) کا یہ سامان کیا ہے، تو وہ تم سے تمہارے رویہ کے بارے میں باز پرس کیسے نہیں کرے گا اور اپنی نعمتوں کا حساب تم سے کیوں نہیں لے گا۔ اس کی ربوبیت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ حساب کا دن لائے اور شکر گزاروں کو اچھا صلہ دے اور ناشکروں کو سزا دے۔

۲۶۔ یعنی قیامت کے دن کا عذاب۔

۲۷۔ اس سایہ سے جو دھوئیں کی شکل میں ہوگا، کافروں کو میدان حشر میں سابقہ پیش آئے گا۔ اس کی تین شاخیں ہوں گی۔ یہ اشارہ غالباً اس کی تین خصوصیات (Charecteristic) کی طرف ہے۔ اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مجرم پر اسی خصوصیت کا دھواں مسلط کر دیا جائے گا۔

۲۸۔ یعنی دوزخ سے جو شعلے اٹھ رہے ہوں گے وہ میدانِ حشر میں مجرموں پر آ کر گر رہے ہوں گے اور وہ جس سایہ کے نیچے ہوں گے وہ انہیں ان شعلوں کی زد سے بچا نہ سکے گا۔

۲۹۔ یعنی جہنم سے جو چنگاریاں خارج ہو رہی ہوں گی وہ محل کی طرح بلند ہوں گی اور ان کی ہیئت بھی محل کی ہوگی۔ تاکہ مجرموں کو دنیا کے محل یاد آ جائیں جن میں وہ دادِ عیش دیتے رہے۔

۳۰۔ دوزخ سے نکلنے والی چنگاریاں گویا میزائیل ہوں گی، جو میدانِ حشر میں مجرموں کو نشانہ بنائیں گی۔ ان چنگاریوں کی شکل محل کے علاوہ زرد اونٹوں جیسی بھی ہوگی۔ تاکہ مجرموں کو اپنے قیمتی اونٹ یاد آ جائیں، جن کو انہوں نے دنیا میں اصل سرمایا سمجھ رکھا تھا اور اس کی محبت میں گرفتار ہو کر آخرت کو نظر انداز کر دیا تھا۔

۳۱۔ میدانِ حشر میں مجرموں کو مختلف مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ ایک مرحلہ وہ ہوگا جب ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے اعضاء بول پڑیں گے کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (یٰس: ۶۵)

''آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں۔''

۳۲۔ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع اس سے پہلے ہی دیا جا چکا ہوگا، اس مرحلہ میں جب ان کا منہ بند کر دیا جائے گا انہیں عذر پیش کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

۳۳۔ یعنی سوچو کہ میدانِ حشر میں جھٹلانے والوں کا حال کتنا بُرا ہوگا۔

۳۴۔ یہ بات خاص طور سے نبی ﷺ کے مخالفین سے خطاب کر کے کہی جائیگی کہ تم لوگ فیصلہ کے دن کا انکار کرتے تھے تو دیکھو تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔

آج فیصلہ کا دن ہے اور فیصلہ کے لئے ہم نے تم کو بھی حاضر کر دیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے گزر چکے تھے۔ مراد گزرے ہوئے زمانہ کے گمراہ لوگ ہیں جن کے نقشِ قدم پر یہ لوگ چلتے رہے۔ یہ بات موقع کے لحاظ سے ارشاد ہوئی ہے ورنہ قیامت کے دن بلا استثناء تمام انسانوں کو جو دنیا میں پیدا ہوئے تھے دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ اس طرح پوری نوع انسانی اس روز حاضر کر دی جائے گی۔

۳۵۔ یعنی دنیا میں تو تم میرے کلمہ کو نیچا دکھانے اور میرے رسول کو شکست دینے کے لئے طرح طرح کی چالیں چلتے رہے، اور سازشیں کرتے رہے اور یہ نہ سوچا کہ فیصلہ کا ایک دن مقرر ہے۔ اب اگر تم میں کچھ بل بوتا ہے تو میرے مقابلہ میں کوئی تدبیر کر دکھاؤ۔ اس کا جواب وہ کیا دے سکیں گے البتہ پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ تو جھٹلانے والوں کے لئے اس روز پشیمانی اور ندامت ہوگی۔

۳۶۔ اب مکذبین (جھٹلانے والوں) کے مقابل میں متقین کی جزا بیان کی جا رہی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جو اللہ سے ڈرتے رہے اور جنہوں نے اس احساس کے ساتھ زندگی گزاری کہ قیامت کے دن انہیں اللہ کے حضور جوابدہی کرنا ہے۔ وہ جن انعامات سے نوازے جائیں گے ان کا مختصر ذکر یہاں ہوا ہے۔ وہ حقیقی سایہ میں ہوں گے۔ اس لئے ان کو ہر طرح کا اطمینان اور راحت حاصل ہوگی۔ اور اللہ جن کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے ان کے سکون اور راحت کا کیا کہنا! دوسری چیز جو اُن کو سیراب کرے گی اور تشنگی کی تکلیف انہیں کبھی محسوس نہ ہونے دے گی، وہ جنت کے چشمے ہوں گے جو انہیں اعلیٰ اور لذیذ مشروب مہیا کریں گے۔

۳۷۔ تیسری بڑی نعمت ان کے لئے یہ ہوگی کہ وہ اپنی پسند کے میوے نوش کریں گے۔ جب ان کے ذوق کے مطابق ان کو میوے فراہم ہوں گے اور وہ بھی بہ کثرت، تو وہ کس قدر شاداں و فرحاں ہوں گے!

تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔ جب
ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو، تو جھکتے نہیں ہیں۔ تباہی
ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔ (القرآن)

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

۴۳ کھاؤ اور پیو مزے سے، اپنے اعمال کے بدلہ میں۔۳۸؎

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾

۴۴ ہم نیکوکاروں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔۳۹؎

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

۴۵ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔۴۰؎

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

۴۶ کھاؤ اور مزے کر لو تھوڑے دن۔تم مجرم ہو۔۴۱؎

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

۴۷ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾

۴۸ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو، تو جھکتے نہیں ہیں۔۴۲؎

وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾

۴۹ تباہی ہے اس دن، جھٹلانے والوں کے لئے۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

۵۰ اب اس کے بعد وہ کس کلام پر ایمان لائیں گے؟۴۳؎

۳۸۔ نیک اعمال کا یہ بدلہ کہ جنت کی زندگی جس میں کھانے پینے کی فراوانی اور چیزیں بھی ایسی جو نہایت لذیذ اور مرغوب ہوں کتنا بہترین بدلہ ہے۔

۳۹۔ یہ ترغیب ہے لوگوں کو نیکوکار بننے کی کہ اپنے آپ کو اس بہترین جزا کا مستحق بناؤ۔

۴۰۔ جھٹلانے والے سوچیں کہ قیامت کا دن ان کے لئے کتنی بڑی محرومی کا ہوگا۔ ایک طرف نیکوکار جنت کا لطف حاصل کر رہے ہوں گے اور دوسری طرف جھٹلانے والے جہنم کی تباہ کاریوں کا شکار ہوں گے۔

۴۱۔ یہ سورہ کے خاتمہ کی آیتیں ہیں۔ کافروں کو خطاب کر کے انہیں آخری مرتبہ جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ اے مجرمو! اس تمام تذکیر کے باوجود اگر تمہیں اپنی کافرانہ روش پر اصرار ہے، تو دنیا میں چند دن مزے کر لو اس کے بعد تمہیں لازماً تباہی سے دوچار ہونا ہے۔

۴۲۔ یعنی قرآن اور پیغمبر انہیں اللہ کے حضور جھکنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اور جو اللہ کے حضور نہ جھکے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔

'اِرکعوا' کے معنی ہیں جھکو۔ اور اللہ کے حضور جھکنے کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اس کی عبادت و اطاعت اور رکوع اور سجدہ سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

۴۳۔ یعنی قرآن جو اللہ کا آخری کلام ہے اور جس نے مضبوط دلائل کے ذریعہ اپنی حجت قائم کر دی ہے اور جس کی حکمت، حکمتِ بالغہ، جس کا اسلوب مؤثر اور جس کی تذکیر دلوں کو مسخر کرنے والی ہے، اس پر بھی اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آخر وہ کس کلام کے منتظر ہیں؟ اگر وہ قرآن سے بھی نصیحت پذیر نہیں ہوئے، تو پھر کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہو سکتی جو ان کو ہوش میں لائے اور نہ قرآن کے بعد کوئی کتاب نازل ہونے والی ہے، اس لئے جس کو ایمان لانا ہے قرآن پر ایمان لائے۔

سورۂ النباء

۷۸۔ سُوْرَۃُ النَّبَا

نام اس سورہ کا نام ''النَّبا'' ہے جس کے معنیٰ اہم خبر کے ہیں۔ مراد قیامت اور دوبارہ اٹھائے جانے کی خبر ہے۔ یہ نام اس سورہ کی آیت ۲ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور ابتدائی آیات ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سورہ اس وقت کی تنزیل ہے، جب نبی ﷺ نے اہل مکہ کو قیامت کے آنے اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی خبر دی تھی۔ جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قیامت کو ناممکن قرار دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ حالات دعوت کے پہلے مرحلہ ہی میں پیش آئے تھے۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا مرکزی مضمون قیامت کے دن عدالتِ خداوندی کا برپا ہونا۔ اور انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دینا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں ان لوگوں کو سرزنش کی گئی ہے، جو قیامت کے عظیم اور ہولناک واقعہ کی خبر سن کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ گویا قیامت کی خبر ان کے نزدیک کسی سنجیدہ غور و فکر کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب قیامت واقعہ کی صورت میں ان کے سامنے آنمودار ہوگی۔ اور یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہوں گے۔

آیت ۶ تا ۱۶ میں اللہ کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں، جو زندگی اور موت کے نہ صرف ممکن الوقوع ہونے پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ اس بات کی بھی شہادت دیتی ہیں کہ روزِ جزا ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ اللہ کی ربوبیت اور حکمت کا عین تقاضا ہے۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں بتایا گیا ہے کہ روزِ جزا کا ظہور مقررہ وقت پر ہوگا۔ اس روز آسمان و زمین کے نظام میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا اور تمام انسان زندہ ہو کر عدالتِ خداوندی کی طرف چل پڑیں گے۔

آیت ۲۱ تا ۳۰ میں سرکشوں کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ اور آیت ۳۱ تا ۳۶ میں خداخوفی کے ساتھ زندگی گذارنے والوں کا۔

آیت ۳۷ تا ۴۰ خاتمۂ کلام ہے، جس میں عدالتِ خداوندی میں حاضری کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اور واضح کیا گیا ہے کہ لوگ باطل شفاعت کے بل پر جوابدہی سے نہیں بچ سکتے۔

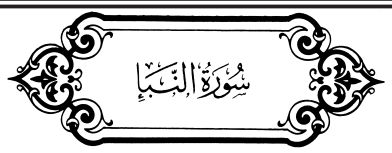

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١
عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيْمِ ۝٢
الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣
كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤
ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦
وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝٧
وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝٨
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝٩
وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝١٠
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝١١
وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝١٢
وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝١٣
وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝١٤
لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝١٥
وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝١٦
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝١٧
يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝١٨
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝١٩

۷۸۔ سُوْرَةُ النَّبَا

آیات: ۴۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟
۲ اُس بڑی خبر کے بارے میں، ۱؎
۳ جس کے متعلق (خود) یہ مختلف باتیں کر رہے ہیں؟ ۲؎
۴ ان کی باتیں غلط ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا،
۵ پھر سُن لو! ان کے خیالات باطل ہیں۔ وہ جلد ہی جان لیں گے۔ ۳؎
۶ کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا؟ ۴؎
۷ اور پہاڑوں کو میخیں، ۵؎
۸ اور کیا تم کو جوڑوں کی شکل میں پیدا نہیں کیا؟ ۶؎
۹ اور کیا تمہاری نیند کو باعث سکون بنایا، ۷؎
۱۰ اور رات کو لباس، ۸؎
۱۱ اور دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا۔ ۹؎
۱۲ کیا تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان نہیں بنائے، ۱۰؎
۱۳ اور ایک روشن چراغ پیدا نہیں کیا، ۱۱؎
۱۴ اور کیا ہم نے بادلوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا، ۱۲؎
۱۵ تاکہ اُگائیں اس کے ذریعہ غلہ اور نباتات،
۱۶ اور گھنے باغ۔
۱۷ بیشک فیصلہ کا دن ایک مقرر وقت ہے، ۱۳؎
۱۸ جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم آؤ گے فوج در فوج، ۱۴؎
۱۹ اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہوجائیں گے، ۱۵؎

۱۔ بڑی خبر سے مراد قیامت اور روزِ جزا کے واقع ہونے کی خبر ہے۔ قرآن نے جب یہ خبر سنائی، تا کہ لوگ متنبہ ہو کر ذمہ دارانہ زندگی گذاریں، تو مشرکینِ مکہ اس کا مذاق اڑانے اور اس کے خلاف آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آیت کا اشارہ ان کی انہی چہ میگوئیوں کی طرف ہے۔

۲۔ مشرکینِ مکہ کے خیالات روزِ جزا اور آخرت کے بارے میں مختلف تھے۔ وہ انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے کو سرے سے ممکن ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟ کچھ لوگوں کے نزدیک آخرت کا تصور کوئی معقول بات نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے ''زندگی تو بس دنیا کی زندگی ہے مرنے کے بعد ہمیں اٹھایا نہیں جائے گا۔'' اور کچھ لوگ آخرت کے بارے میں شک اور تذبذب میں مبتلا تھے۔ ان کے یہ خیالات کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں تھے بلکہ یہ محض اٹکل پچو باتیں تھیں۔

واضح رہے کہ قیامت اور روزِ جزا سے انکار کے معاملہ میں مشرکینِ عرب منفرد نہ تھے۔ بلکہ جہاں تک دیگر مشرکانہ مذاہب کا تعلق ہے، وہ بھی نہایت الجھی ہوئی باتیں پیش کرتے ہیں، جس کا اندازہ درج ذیل اقتسابات سے ہوگا۔

Extract From The Encyclopedia Of Religion And Ethics, Volume V :

Hindu : Although in the Rigveda no clear statement of Judgment is found, and Yama appears mainly as king of the region of bliss, yet he is to some extent an object of terror, and a dark underground hell is spoken of as the fate of evil-doers (iv. 5.5, vii 104.3, ix-73.8)..... The later views differ widely from this, through the gradual introduction of the belief in transmigration, while Yama is now the judge of the dead.....In the Upanishads re-birth in various conditions, in heaven, hell or on earth, appears as the result of ignorance of the true end of existence ..... Hinduism in all its forms endorses this view. All go to Yama over a dreadful road, on which the pious fare better than the wicked. Yama or Dharma judges and allots the fate. Through endless existences and re-births --- in human, animal, or plant forms --- alternated with lives in the heavens or hells, the soul must pass.

Buddhist : In Buddhism the idea of karma afforded an automatic principle of judgment, whereby the person after death entered upon an existence, higher or lower, according to his actions. At death, the force resulting from actions combined with clinging to existence causes creation of the five skandhas, or constituent elements of being. This is so swift that there is hardly any break in the continuity of personality, which is thus re-created in one of the six states ---gods, men, asuras, animals, plants, pretas, or inhabitants of one of the hells.(p.375)

لیکن ان تمام الجھی ہوئی باتوں کے باوجود، یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس دنیا کا ایک دن خاتمہ ہونا ہے۔ اور موجودہ سائنس اس کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار آگے چل کر لکھتا ہے:۔

Conclusion : The ideas regarding the end of the world which are found in most eschatologies may be regarded as mythical speculations prompted by knowledge of actual catastrophes in Nature and of its phenomena. The world, as science teaches, and as the speculations of men suggested, must have an end; but they pictured that end in lurid colours, while generally anticipating after it a new order. (p. 391)

قرآن جزائے عمل کیلئے ایک نئے نظامِ عمل کے ساتھ، نئے عالم کے برپا کئے جانے کی خبر کو محض اندھے عقیدہ (Dogma) کے طور پر نہیں، بلکہ آفاق وانفس کی نشانیوں (عقلی دلائل) کے ساتھ اتنے دلنشیں پیرایہ میں پیش کرتا ہے کہ کسی قسم کے شک وشبہ اور اختلاف کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور ضمیر پکار اٹھتا ہے کہ روز جزا کا برپا کیا جانا نہ صرف ممکن، بلکہ ضروری ہے۔ اور قرآن آگے بڑھ کر پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ یوم جزا لازماً برپا ہوگا۔

۳۔ یعنی وہ وقت دور نہیں جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ روز جزا کے بارے میں ان کی قیاس آرائیاں غلط تھیں۔ یہ حقیقت موت کے آتے ہی عالمِ برزخ

میں جو قیامت تک کیلئے روحوں کا ٹھکانہ ہے، ان پر کھل جائے گی۔ اور پھر قیامت کے دن جب تمام انسانوں کو جسم سمیت دوبارہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا، وہ اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کریں گے۔ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ (انہیں عنقریب معلوم ہوجائے گا) کی تکرار ان دو مواقع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۴۔ کرۂ زمین اگرچہ فضا میں معلق ہے اور سورج کے گرد گردش بھی کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ نیز اس کی سطح کو اس طرح پھیلا دیا گیا ہے کہ اس پر آبادی ممکن ہوئی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص انسان کو بسانے ہی کیلئے زمین کو فرش بنا کر ان تمام چیزوں کا انتظام کیا گیا ہے، جو انسانی زندگی کے لئے مطلوب ہیں۔ گویا زمین پر انسان کو بسانے کا کام ایک منصوبہ کے تحت عمل میں آیا ہے۔ کیا اس میں اللہ کی ربوبیت اور حکمت کی کھلی نشانی موجود نہیں ہے؟

۵۔ زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دینے سے اس کی رفتار اور گردش میں توازن پیدا ہوگیا ہے۔ اور اضطراب کی کیفیت نہیں رہی۔ مزید براں پہاڑوں سے انسانوں کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً دریاؤں کی شکل میں پانی کے ذخائر وغیرہ۔

۶۔ ایسا نہیں ہوا کہ صرف مرد پیدا کر دیئے گئے ہوں، یا عورتیں ہی عورتیں پیدا کر دی گئی ہوں۔ بلکہ مرد اور عورت کے جوڑے کی شکل میں انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس جوڑے کا ہر فرد اپنی جسمانی اور نفسانی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان میں تضاد اور مخالفت نہیں، بلکہ توافق اور مودّت پیدا کر دیتا ہے۔ گویا وہ ایک دوسرے سے مِل کر مکمل ہوجاتے ہیں۔ کیا انسان کی تکمیل کا یہ سامان اپنے اندر اللہ کی ربوبیت اور حکمت کی کوئی نشانی نہیں رکھتا؟

۷۔ نیند انسان کی تکان کو دور کرتی ہے اور اس کے بعد وہ تازہ دم ہوجاتا ہے۔ اگر نیند کا داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نہ رکھا ہوتا، تو مسلسل محنت کرنے سے اس کے قویٰ جواب دیدیتے۔ اور وہ پرسکون زندگی گذارنے کے قابل نہ رہتا۔ انسان کو آرام اور سکون بہم پہنچانے کا یہ انتظام کس قدر حیرت انگیز ہے! کیا یہ بھی کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے یا ایک مدبّر کا حکیمانہ منصوبہ؟

۸۔ اگر زمین پر دن ہی دن ہوتا تو انسان کے تحفظ اور راحت کا سامان نہیں ہوسکتا تھا۔ آفتاب کی مسلسل تمازت انسان کو سکون و راحت سے محروم کر دیتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک ایسے قانون میں جکڑ دیا ہے کہ وہ اپنے محور پر برابر گردش کرتی رہتی ہے، جس سے رات اور دن کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اس طرح رات کی چادر انسان کو اپنے اندر اسی طرح چھپا لیتی ہے جس طرح کہ لباس۔ کیا زمین کی اس گردش کے پیچھے جو اس عظیم مقصد کو لئے ہوئے ہے، کسی مدبر کا ہاتھ کارفرما نہیں ہے؟

۹۔ اگر زمین پر رات ہی رات ہوتی، تو معاشی دوڑ دھوپ اور گذر بسر کے لئے وہ سازگاری انسان کو ہرگز میسر نہ آتی، جس کی بنا پر وہ ایک بہترین مخلوق کی حیثیت سے زندگی گذار رہا ہے۔ اور اقتصادی ترقی کے لئے بے شمار، راہیں اس پر کھل گئی ہیں۔ کیا یہ اللہ کی ربوبیت کا کرشمہ نہیں ہے؟

۱۰۔ یعنی اللہ کی پیدا کردہ کائنات کی وسعت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہو کہ حد نظر تک دکھائی دینے والا آسمان، صرف آسمان اوّل ہے۔ ایسے سات آسمان اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں۔ اور اجرام سماوی کو مستحکم بنایا ہے کہ ایک طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود، ان میں شکست و ریخت کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔ اور اس کے حسن و جمال میں ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوا۔ نیز قوانینِ قدرت کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ کہیں سے کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر آسمان کا نظام مضبوط نہ بنایا گیا ہوتا، تو زمین کا نظام ہرگز قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ کیا اس میں اللہ کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی عظیم نشانیاں موجود نہیں ہیں؟

۱۱۔ سورج کو ایسا روشن بنایا گیا ہے کہ اس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ موجودہ سائنس کی روشنی میں سورج کو دیکھئے تو کمالاتِ خداوندی کے پہلو اور روشن ہوکر سامنے آئیں گے۔ سورج کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ وہ زمین سے ایک سو گنا سے زائد بڑا ہے۔ اسے زمین

سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر رکھا گیا ہے، جس کی وجہ سے زمین پر نہ بے انتہا گرمی ہوتی ہے نہ بے انتہا سردی۔ بلکہ زندہ مخلوق کیلئے جو درجۂ حرارت مطلوب ہے ٹھیک وہی درجۂ حرارت یہاں رہتا ہے۔ اور سورج کی اسی حرارت سے بارش بھی ہوتی ہے اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ پھر کیا تمہیں اس روشن چراغ سے بھی اللہ کی قدرت اور ربوبیت کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ملتی؟

۱۲۔ بادلوں کے ذریعہ انسانی آبادی کو وافر پانی مہیا کرنے کا انتظام، اور اس کے ذریعہ غلہ اور سبزی کی پیداوار اور گھنے باغوں کا اُگ جانا، جس سے انسان کی رزق رسانی کا سامان ایک تسلسل کے ساتھ ہو رہا ہے، کیا انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی کا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا، جو اس کی پرورش کا پورا پورا انتظام کر رہی ہے؟

۱۳۔ یہ ہے وہ بات، جس پر اوپر کے مضمون آیت ۶ تا ۱۶ میں استدلال کیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ فیصلہ کا دن (Day Judgement of) ایک امر قطعی ہے۔ اور اس کے وقوع کا وقت بھی بالکل مقرر ہے۔ مشرکین مکہ اس کو ماننے سے اس بناء پر انکار کر رہے تھے کہ اس سے انسان کا دوبارہ اٹھایا جانا لازم آتا ہے، جو ان کے نزدیک ایک ناممکن بات تھی۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ انسان جب مر کر مٹی میں مل گیا تو اسے دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے؟ وہ اپنی تنگ ذہنیت کی بنا پر اللہ کی قدرت و حکمت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے عقل کو اپیل کرنے والا انداز اختیار کیا گیا۔ اور فیصلہ کے دن پر اللہ کی قدرت اور اس کی ربوبیت و حکمت سے استدلال کیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ زمین، یہ آسمان اور یہ طرح طرح کی نعمتیں جن سے تمہاری زندگی وابستہ ہے، کس بات کی شہادت دے رہی ہیں؟ کیا اس بات کی کہ ان کا خالق نہایت محدود قدرت والا ہے، اور اس کے کاموں میں مقصدیت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں چلتا، اور اس کائنات کے اجزاء بالکل بے ترتیب ہیں اور یہ پورا کارخانہ (Unsystematic) معلوم ہوتا ہے؟

یا یہ کہ آفاق و انفس کے یہ آثار اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ تمہارا خالق زبردست قدرت کا مالک ہے۔ اور نہ صرف زبردست قدرت کا مالک ہے، بلکہ ساتھ ہی وہ ربوبیت اور حکمت کی صفات سے بھی متصف ہے۔ اللہ کو ان صفات سے متصف مان لینے کے بعد روز جزا کو مان لینے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ان صفات کا لازمی تقاضا قرار پاتا ہے کہ روز جزا برپا ہو۔ جب یہ واضح ہوا کہ اللہ زبردست قدرت کا مالک ہے، پھر اس کے لئے مُردہ کو زندہ کرنا نہایت آسان بات ہے۔ اس کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟ اور پھر جو ہستی انسان کی ربوبیت کا سامان اس اہتمام کے ساتھ کر رہی ہو اور جس نے ان گنت نعمتوں سے اسے نوازا ہو، وہ اپنی ان نعمتوں کا حساب اس سے کیوں نہ لے گی؟ اور اپنے وفادار بندوں کو انعام کا مستحق اور سرکشوں کو مستحقِ سزا کیوں نہ ٹھہرائے گی؟ اس کی حکمت کا ظہور اس کائنات کی ایک ایک چیز سے ہو رہا ہے۔ اس کا ہر کام دانائی پر مبنی ہے اور منصوبہ بند ہے۔ پھر کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انسان ہی کی تخلیق بے مقصد ہوئی ہے؟ اسے مر کر مٹی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں، نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے والے اور اس سے کفر کرنے والے اس کے اطاعت شعار اور اس کے نافرمان سب برابر ہیں۔ نہ کسی کو انعام ملنا ہے اور نہ کسی کو سزا۔ اللہ کی عدالت کوئی عدالت ہی نہیں، جہاں جواب دہی کیلئے حاضری کا سوال ہو۔ کیا اس قسم کی باتیں تمہاری عقل میں سماتی ہیں اور اس کی صفتِ حکمت سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس حکمت کا مُشاہدہ انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں کرتا ہے، اس کا یہ تقاضا ہے کہ یوم جزا برپا ہو۔ اس سے قرآن کی اس خبر کی بھی مکمل تائید ہوتی ہے کہ جزا کا ایک دن مقرر ہے۔ اُس روز تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے فرمانروائے کائنات کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

۱۴۔ یعنی قیامت کے دن بگل بجتے ہی سارے مُردہ انسان زندہ ہو کر عدالت خداوندی میں حاضر ہونے کے لئے نکل پڑیں گے۔

۱۵۔ عالم بالا کی حقیقتیں آج انسان کی نظروں سے چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن قیامت کے دن انسان آسمان کے کھل جانے سے ان کا مشاہدہ کرے گا۔

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾	۲۰ اور پہاڑ چلائے جائینگے۔تو وہ سراب بن کر رہ جائیں گے۔۱۶؎
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾	۲۱ بے شک! جہنم گھات میں ہے،
لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾	۲۲ سرکشوں کا ٹھکانہ ، ۱۷؎
لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾	۲۳ جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔۱۸؎
لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾	۲۴ وہاں وہ نہ کسی قسم کی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا،
اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾	۲۵ بجز گرم پانی اور پیپ کے،
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾	۲۶ ان کے کرتوتوں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ!
اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾	۲۷ وہ حساب کی امید نہ رکھتے تھے،
وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾	۲۸ ہماری آیتوں کو یکسر جھٹلا دیا تھا۔
وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾	۲۹ ہم نے ہر چیز کو لکھ کر ضبط کر رکھا تھا،۱۹؎
فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾	۳۰ تو چکھو! اب ہم تمہارے عذاب ہی میں اضافہ کریں گے۔
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾	۳۱ یقیناً متقیوں کیلئے کامیابی ہے،۲۰؎
حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾	۳۲ باغ اور انگور،
وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾	۳۳ اور نوخیز ہمسن لڑکیاں،
وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾	۳۴ اور چھلکتے جام،۲۱؎
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾	۳۵ وہاں وہ نہ کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ جھوٹی بات۔۲۲؎
جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾	۳۶ یہ تمہارے رب کی طرف سے جزا ہوگی اور کافی انعام،۲۳؎
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾	۳۷ اسکی طرف سے، جو آسمانوں اور زمین اور اسکے درمیان کی ساری چیزوں کا مالک ہے۔رحمٰن، جس سے بات کرنے کا کسی کو یارا نہیں۔۲۴؎
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾	۳۸ جس دن روح (الامین)۲۵؎ اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔کوئی بات نہ کر سکے گا سوائے اس کے، جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ بالکل درست بات کہے گا۔۲۶؎
ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾	۳۹ یہ دن برحق ہے ۲۷؎ تو جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے۔
اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾	۴۰ ہم نے تمہیں ایک ایسے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے، جو قریب آلگا ہے ۲۸؎۔جس دن آدمی دیکھ لے گا کہ اس نے آگے کیلئے کیا کیا ہے ۲۹؎۔اور کافر کہے گا۔کاش میں مٹی ہوتا ! ۳۰؎

۱۶؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ قیامت کے دن اس دنیا کا نظام بدل جائے گا۔ یہ زمین ایک چٹیل میدان کی شکل اختیار کر لے گی۔ جہاں تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے عدالت برپا کی جائے گی۔ بڑے بڑے پہاڑ فضا میں اڑ رہے ہوں گے اور ان کی جگہ ریت کا میدان ہوگا۔ میدان حشر میں ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس سے قیامت کے دن کی ہولناکی، زمین کی ساخت میں عظیم تبدیلیوں کے رونما ہو جانے اور میدانِ حشر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۷؎ خدا کے سرکش بندے دنیا میں خدا سے بے خوف ہو کر زندگی گذارتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے عذاب اور خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن قیامت کے دن جہنم اس طرح ظاہر ہوگی، جیسے وہ گھات ہی میں تھی۔ اور وہ اس میں ایسے پھنسیں گے کہ پھر کبھی اس سے نکل نہ سکیں گے۔

۱۸؎ یعنی ایک دور کے بعد دوسرا دور۔ اور اس طرح وہ مسلسل عذاب ہی میں رہیں گے۔ اتنی سخت سزا اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کی جگہ اللہ سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ اپنے محسنِ حقیقی کی ناشکری کرتے رہے اور روز جزا کو ماننے اور اس کے مطابق ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ لہٰذا جو بیج انہوں نے بویا تھا اسی کے وہ پھل کاٹتے رہیں گے۔

۱۹؎ یعنی ان کے اعمال کا ریکارڈ ہم تیار کر رہے تھے۔ گویا ہر شخص کی زندگی کی مکمل بولتی فلم تیار کی جا رہی تھی، جس میں اقوال و افعال ہی نہیں، نیتوں تک کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ اور یہ اس خام خیالی میں مبتلا رہے کہ اپنی من مانی کرنے کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ اور ان کے اعمال کا کوئی ریکارڈ تیار نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ انہیں نہ کوئی ایسا کیمرہ دکھائی دیتا تھا جو ان کی عملی زندگی کی تصویر کھینچ رہا ہو۔ اور نہ کوئی ٹیپ ریکارڈ جو ان کی باتوں کے کیسٹ تیار کر رہا ہو۔

۲۰؎ یہاں متقین کا لفظ طاغین (سرکش) کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ اور یوم جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی آیات کو مانتے ہیں اور اُسی طور سے زندگی گذارتے ہیں کہ انہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔

۲۱؎ مراد شرابِ طہور کے جام ہیں۔

۲۲؎ یعنی جنت کا ماحول نہایت پاکیزہ ہوگا۔ سوسائٹی بھی پاک اور کھانے پینے کی تمام اشیاء بھی پاک۔ یہاں تک کہ وہاں کی شراب بھی دنیوی شراب کی طرح نہیں ہوگی کہ آدمی پی کر بکواس کرنے لگے۔ بلکہ وہ نہایت پاکیزہ ہوگی اور اس سے ایسے سرور کی کیفیت پیدا ہوگی، جس میں بیہودگی کا کوئی عنصر نہ ہوگا۔ اسی طرح وہاں دوسری لغویات اور تماشے بھی نہیں ہونگے۔ اور نہ جھوٹ و افترا پردازیوں کا وجود ہوگا۔ بلکہ وہ ایک سنجیدہ اور پُرمسرت ماحول ہوگا، جہاں ہر طرف اخلاق اور شرافت کے نمونے ہی دکھائی دیں گے۔

۲۳؎ متقیوں کو ان کے نیک اعمال کی صرف جزا دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی طرف سے کافی انعامات سے بھی نوازے گا۔

۲۴؎ یعنی قیامت کے دن جب خداوندِ کائنات اپنی عدالت برپا کرے گا، تو اس عدالت کے رعب کا عالم یہ ہوگا کہ کوئی اس کے حضور زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ اس سے مشرکین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ ان کے دیوی دیوتا جو چاہیں گے خدا سے منوا سکیں گے۔

۲۵؎ روح سے مراد روح الامین یعنی جبریل ہیں۔ فرشتوں کے سردار ہونے کی حیثیت سے ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور بتلانا یہ مقصود ہے کہ روز قیامت جب اللہ عدالت برپا فرمائے گا تو فرشتے، حتیٰ کہ جبریل بھی صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ سب پر ہیبت طاری ہوگی اور کسی کی یہ مجال نہ ہوگی کہ بلا اجازت بول سکے۔

۲۶۔ مقصود سفارش کے غلط تصور کی تردید ہے، جس میں اہل مذاہب گرفتار ہیں۔ جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر قیامت آ ہی گئی اور اعمال کی جوابدہی کے لئے خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا، تو یہ دیوی دیوتا جن کی وہ پوجا کرتے رہے ہیں، ہمارے سفارشی بن کر کھڑے ہوں گے اور ہمیں عذاب سے نجات دلوا کے رہیں گے۔ لیکن قرآن بتلاتا ہے کہ اول تو کسی ''دیوی دیوتا'' کا آخرت میں وجود ہی نہیں ہوگا۔ سب اللہ کے عاجز بندے کی حیثیت سے پیش ہونگے۔ اور سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور عدالتِ خداوندی کے رعب کا عالم یہ ہوگا کہ مقرب ترین فرشتے بھی بات کرنے کی جرأت نہ کریں گے۔ اگر سفارش کے لئے کوئی زبان کھول سکے گا تو وہی جس کو اللہ اجازت دے۔ اور اس صورت میں وہ ٹھیک اور درست بات ہی کہے گا۔ اور مشرکین کے لئے سفارش تو کوئی بھی نہیں کر سکے گا۔ کیوں کہ ایسے لوگوں کے حق میں سفارش کرنا۔ اللہ کے اس فیصلے کی بنا پر کہ جو نا قابل معافی جرم کے مرتکب ہی ہوئے، درست بات نہ ہوگی۔ اللہ کی اجازت کے بعد کسی کی سفارش کیلئے کوئی زبان کھولے گا بھی، تو صرف ایسے گنہگار بندوں کے لئے، جو اہل ایمان ہوں۔ اور جن کے حق میں اللہ سفارش قبول کرنا پسند فرمائے۔ لہٰذا کوئی شخص اس خام خیالی میں مبتلا نہ رہے کہ وہ خواہ شرک و کفر کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو، اور خواہ اس نے ایک سرکش کی حیثیت سے زندگی کیوں نہ گذاری ہو، کسی نہ کسی کے طفیل اس کی نجات ہو جائے گی۔

۲۷۔ یعنی جزا کا دن قیاس واٹکل کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے، جس کی خبر پوری صداقت کے ساتھ تمہیں دی جا رہی ہے۔

۲۸۔ قریب اس اعتبار سے کہ دنیا کی بیشتر عمر گذر چکی ہے۔ اب قیامت کے آنے میں جو وقت باقی رہ گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ ویسے بھی وقت ایک اضافی چیز ہے۔ قیامت کے دن جب زمان و مکان کے پیمانے بدل جائیں گے، انسان نے جو وقت دنیا میں گذارا تھا، اسے بہت تھوڑا معلوم ہوگا۔

۲۹۔ انسان دنیا میں اچھے بُرے جو کام بھی کرتا ہے، اس کا لازماً ایک اثر اور ایک نتیجہ ہے، جو دوسری زندگی (آخرت) میں مرتب ہوگا۔ اس حقیقت کو مَاقَدَّمَت یَدَاہُ (جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ انسان کا ہر عمل اس کے اپنے ہاتھوں بیج بونے کے مترادف ہے، جس کے پھل وہ آنے والی زندگی میں کاٹے گا۔

۳۰۔ یعنی جو لوگ روز جزا کو ماننے اور اس کی بنیاد پر ذمہ دارانہ زندگی گذارنے سے انکار کر رہے ہیں، وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ یوم جزا برپا ہوگا۔ اور انسان اپنے کرتوت اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ تو ایسے لوگوں کے حصہ میں سوائے حسرت اور پچھتاوے کے کچھ نہیں آئے گا۔ اس وقت ہر منکرِ آخرت کو احساس ہوگا کہ کاش وہ مر کر مٹی میں مل گیا ہوتا اور حساب دینے کی نوبت ہی نہ آتی!

۷۹۔ النّازعات

نام سورہ کا آغاز والنازعات سے ہوا ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام ''النازعات'' رکھا گیا ہے۔ یہ لفظ ہواؤں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورہ نبا کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا موضوع قیامت کا وقوع، اور جزائے عمل کے لئے انسان کو دوبارہ اٹھایا جانا ہے۔ پس منظر میں خاص طور سے وہ سرکش اور فرعون صفت لوگ ہیں، جو اپنی دنیا بنانے میں مست رہتے ہیں۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں روز جزا پر ہواؤں کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۶ تا ۱۴ میں حادثۂ قیامت کی تصویر پیش کرتے ہوئے منکرین کے اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت ۱۵ تا ۲۶ میں حضرت موسیٰ کا مختصراً بیان ہوا ہے کہ کس طرح فرعون، ان کی دعوت کو رد کرنے کے نتیجہ میں عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ یہ گویا مکافاتِ عمل پر تاریخ سے استشہاد ہے۔

آیت ۲۷ تا ۳۳ میں انسان کی دوبارہ پیدائش کے ممکن ہونے پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت سے استدلال کیا گیا ہے۔

آیت ۳۴ تا ۴۱ میں واضح کیا گیا ہے کہ جس دن قیامت کا حادثہ پیش آئے گا، سرکشوں اور دنیا پرستوں کا انجام کیسا بُرا ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرنے والوں کا انجام کتنا خوشگوار ہوگا۔

آیت ۴۲ تا ۴۶ میں منکرین قیامت کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ آخر قیامت کب آئے گی؟

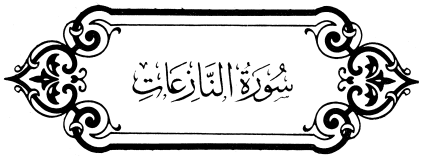

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝١

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝٢

وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝٣

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝٤

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝٥

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝٦

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝٧

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۝٨

اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝٩

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝١٠

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝١١

قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝١٢

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝١٣

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝١٤

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝١٥

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٦

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝١٧

فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ۝١٨

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝١٩

۷۹۔ سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

آیات:۴۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ان (ہواؤں) کی، جو (بادلوں کو) شدت کے ساتھ گھسیٹتی ہیں،

۲ اوران کی جونرم نرم چلتی ہیں،

۳ اوران کی جوسبک رفتار ہیں، ۲

۴ پھر جو (تعمیلِ حکم میں) بازی لے جاتی ہیں،

۵ اورایک کام (بارش) کا انتظام کرتی ہیں۔ ۳

۶ جس دن زلزلہ کا شدید جھٹکا لگے گا،

۷ اس کے پیچھے دوسرا جھٹکا آئے گا۔ ۴

۸ کتنے دل اس دن دھڑک رہے ہوں گے، ۵

۹ نگاہیں ان کی پست ہوں گی۔

۱۰ کہتے ہیں، کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟ ۶

۱۱ (کیا اس وقت) جب کہ ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہوچکی ہوں گی؟ ۷

۱۲ کہتے ہیں، یہ لوٹنا بڑے خسارہ کا ہوگا۔ ۸

۱۳ وہ تو بس ایک ڈانٹ ہوگی، ۹

۱۴ کہ وہ یکا یک میدان میں آموجود ہوں گے۔ ۱۰

۱۵ کیا تمہیں موسیٰ کے واقعہ کی خبر پہنچی ہے؟ ۱۱

۱۶ جب اسکے رب نے اسے طُویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ ۱۲

۱۷ فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہوگیا ہے۔ ۱۳

۱۸ اوراس سے کہو، کیا تو چاہتا ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے، ۱۴

۱۹ اور میں تجھے تیرے رب کی راہ دکھاؤں کہ تو اس سے ڈرنے لگے۔ ۱۵

۱۔ ابتدائی پانچ آیتوں میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے ان کی صرف صفات بیان کی گئی ہیں۔موصوف کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں ہوا ہے۔ اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی حدیث منقول ہے۔رہے تفسیری اقوال تو وہ متعدد ہیں۔بعض نے فرشتے مراد لئے ہیں اور بعض نے ستارے۔کسی کے نزدیک گھوڑے مراد ہیں اور کسی کے نزدیک بادل۔ان میں سے زیادہ مشہور قول جس کو عام طور سے مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ ان سے فرشتے مراد ہیں۔ہم نے درج ذیل وجوہ کی بناہ پر ہوائیں مراد لی ہیں۔

اولاً:۔قرآن کریم میں جہاں اس طرح کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان کی نوعیت استدلال یا استشہاد کی ہے۔یہاں انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر استدلال مقصود ہے، جو ظاہر ہے محسوس چیز ہی سے ہوسکتا ہے۔اور ہوائیں ایک محسوس چیز ہیں، جب کہ فرشتے غیر محسوس۔

ثانیاً:۔ بیان کردہ صفات فرشتوں اور ستاروں وغیرہ کے مقابلہ میں ہواؤں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔

ثالثاً:۔عربی میں ''نزائع'' خاص قسم کی ہواؤں کو کہتے ہیں۔(لسان العرب لفظ **نزع**) نازعات اس سے ملتا جلتا لفظ ہے۔قرآن میں لفظ ''تَنزعُ'' ہوا کے لئے استعمال ہوا ہے۔تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ (القمر: ۲۰) ''وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے''۔

رابعاً:۔قرآن میں دوسرے مقامات پر ہواؤں کی قسم قیامت اور روز جزا پر استدلال کے طور پر کھائی گئی ہے۔(ملاحظہ ہو سورہ ذاریات اور سورہ مرسلات) اس لئے یہاں بھی جب کہ مدلول روزِ جزا ہے، ہوائیں مراد لینا قرآن کے بیان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

خامساً:۔ یہاں صفات مؤنث استعمال ہوئی ہیں اور ہواؤں کے لئے مؤنث صفات کا استعمال عربی میں معروف ہے۔

۲۔ ''السَّابِحَات'' (سبک رفتار) اصل میں گھوڑوں کا وصف ہے۔ یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے ان کے تیز رفتار ہونے کی بنا پر تشبیہہ دی گئی ہے۔گویا بادل ہواؤں کے دوش پر سوار ہیں۔اور وہ بگ ٹٹ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

۳۔ ان آیات میں ہواؤں کی کیفیات اور ان کے تصرفات بیان کئے گئے ہیں، جس سے بارش کا نظام وجود میں آتا ہے۔یہ ہوائیں ہی ہیں جو بادلوں کو ہزاروں میل سے گھسیٹ کر لاتی ہیں۔اور جب کسی علاقہ میں بادل جمع ہوجاتے ہیں تو ہوائیں نرم نرم چلنے لگتی ہیں، جس سے فضا خوشگوار ہوجاتی ہے۔

یہ ہوائیں جو لاکھوں اور کروڑوں لیٹر پانی کا وزن اٹھائے ہوئے چلتی ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سبک رفتار گھوڑے، جو کسی مہم کے لئے دوڑا دئے گئے ہوں۔اور جس طرح بعض گھوڑے بعض پر سبقت لے جاتے ہیں اسی طرح بعض ہوائیں بعض پر بازی لے جاتی ہیں۔فضا میں ہواؤں کی اس یورش کو سابقات سے تعبیر کیا گیا ہے۔بارش کا یہ انتظام ہواؤں ہی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، اس لئے مجازاً ان کو، فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا کہا گیا ہے۔جس طرح سورۂ ذاریات میں انہیں فَالْمُقَسِّمَاتِ اَمْرًا (ایک کام یعنی بارش کو تقسیم کرنے والی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان ہواؤں کو شہادت میں پیش کر کے جس بات پر استدلال کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ روز جزا کا پیش آنا اور انسانوں کا دوبارہ اٹھایا جانا برحق ہے۔ استدلال کی نوعیت یہ ہے کہ ہواؤں کا یہ نظام، اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت، اس کی ربوبیت اور اس کی عظمت وجلال کی زبردست نشانیاں پیش کرتا ہے۔ اور ان پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔بارانی ہوائیں جب چلتی ہیں تو وہ اپنی مختلف کیفیات کے ذریعہ، غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو چونکا دینے کا سامان کرتی ہیں۔مثلاً: بادلوں کو گھسیٹنے کا عمل، جس کے ساتھ کڑک اور بجلی بھی ہوتی ہے اور جو فضا کو خوشگوار بنائے ہوئے، نرم نرم چلتی ہیں اور کبھی سبک رفتار بھی ہوجاتی ہیں۔اسی طرح ہواؤں کے مختلف گروپ جب یورش کرتے ہیں، تو حکم الٰہی کی تعمیل وتنفیذ میں ان کے بازی لے جانے کا وصف بالکل نمایاں ہوجاتا ہے۔رہا تدبیر امر کا پہلو، تو یہ ہوائیں کسی علاقہ میں ابر کرم برساتی ہیں اور کسی علاقہ کو بارش سے محروم رکھ کر آگے نکل جاتی ہیں۔کہیں یہ طوفان

لاتی ہیں اور درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں، تو کہیں خوشگوار چلتی ہیں۔ کبھی گرم لُو کی صورت اختیار کر جاتی ہیں تو کبھی نسیم سحر کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پس یہ ہوائیں یوں ہی نہیں چلتیں بلکہ دلوں کو مس کرتے ہوئے چلتی ہیں۔ اور ہر اُس شخص کے اندر جو غور و فکر کرتا ہے اور حقیقت کو بے لاگ طور پر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ یقین پیدا کرتی ہیں کہ اس کائنات (Univers) کا خالق زبردست قدرت کا مالک ہے، اور وہ نہایت حکمت کے ساتھ اس پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ جس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا کی بھی کوئی غایت اور اس کا کوئی مقصد ہو۔ اور انسان کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے۔ گویا ہواؤں کا یہ نظام جزائے عمل کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اور انسان کی دوسری پیدائش کو نہ صرف ممکن، بلکہ اس کی حکمت کا مقتضیٰ قرار دیتا ہے، جو اس نظام میں کارفرما ہے۔ غرضیکہ ہواؤں کے تصرف اور ان کی کیفیات میں قانونِ جزا کی نشانیاں بالکل نمایاں ہیں۔ اور ان کی شہادت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو ہستی بارانی ہواؤں کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ کرتی ہے وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کر دینے والی ''ہوائیں'' بھی چلا سکتا ہے۔ اور جس طرح ہوائیں سمندر سے پانی کے قطروں کو بخارات کی شکل میں آسمان پر پھیلا دیتی ہیں اور پھر ان منتشر بخارات کو سمیٹ کر پانی کی شکل میں برسا دیتی ہیں، اسی طرح مُردہ انسان کے منتشر اجزاء کو سمیٹ کر دوبارہ زندہ کرنے کا عمل بھی ممکن ہے۔ اور جب اس کی خبر خود اللہ تعالیٰ دے رہا ہے تو پھر اس میں شک کا کیا سوال؟ درحقیقت قیامت سے انکار خدا کی صفتِ قدرت و حکمت سے انکار کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

۴۔ پہلا جھٹکا وہ ہے جب زمین کا موجودہ نظام درہم برہم ہوگا اور تمام انسان مر جائیں گے۔ اور دوسرا جھٹکا وہ ہے جب تمام مُردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اس وقت زمین کی ساخت بدل چکی ہوگی اور اسے ایک نئے نظام کے ساتھ قائم کر دیا گیا ہوگا۔

۵۔ دل قیامت کی ہولناکی اور باز پرس کے ڈر سے دھڑک رہے ہونگے۔ یہ حال کافروں اور فاسقوں کا ہوگا۔ رہے مؤمنین صالحین تو انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

۶۔ یعنی کیا مرنے کے بعد پھر ہمیں زندہ کیا جائے گا؟

۷۔ یہ تھا منکرینِ قیامت کا اشکال، کہ جب انسان کا مادی وجود نہیں رہے گا تو پھر وہ کس طرح وجود میں آسکے گا۔ اور جب اس کا وجود ہی محال ہے تو حشر اور جزاء و سزا کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ان کا یہ اشکال بہ آسانی رفع ہو سکتا تھا، اگر وہ صاف ذہن (Unprejudiced mind) سے اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرتے، جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ یہ مطالعہ خالقِ کائنات کے بارے میں انہیں صحیح معرفت عطا کرتا۔ اور انہیں محسوس ہوتا کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور ہواؤں سے لے کر بارش تک، کائنات کی ہر چیز قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہی ہیں۔

۸۔ اس طرح وہ آخرت کا مذاق اڑاتے تھے۔ کہ اگر واقعی ہمیں دوسری زندگی عطا ہوئی، جس کی اطلاع یہ نبی دے رہا ہے، تو وہ زندگی ہمارے لئے بڑی خسارہ کی ہوگی۔ کیوں کہ ہم اس کا انکار کرتے رہے اور اس کے لئے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔

۹۔ یعنی انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص تیاری نہیں کرنا پڑے گی، بلکہ اس کا صرف ایک حکم اس کے لئے کافی ہو گا۔ اور یہ حکم ڈانٹ کی شکل میں ہوگا، جسے پوری زمین پر بیک وقت نشر کیا جائے گا۔

۱۰۔ یعنی اسی گوشت پوست کے ساتھ انسان سطحِ زمین پر آموجود ہوگا۔ بالفاظ دیگر انسان مرنے کے بعد نہ جانور کا روپ دھارے گا اور نہ کسی اور مخلوق کا۔ بلکہ قیامت کے دن وہ اپنی پہلی حالت ہی میں قبر سے نکل کھڑا ہوگا۔

۱۱۔ یہ تاریخ سے استشہاد ہے کہ رسولوں کو جھٹلانے اور سرکشی اور بغاوت کا رویہ اختیار کرنے والوں پر، اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی عذاب کا کوڑا برساتا رہا ہے۔ جس کی نمایاں مثال فرعون اور اس کا لشکر ہے، جو تباہی سے دوچار ہوا۔ اس میں جزائے عمل کے اس قانون کی ایک جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے

جو قیامت کے دن حرکت میں آئے گا۔

۱۲۔ ''طُویٰ'' اس وادی کا نام ہے جو کوہِ سینا میں ہے۔ اُسے مقدس اس لئے فرمایا کہ اللہ نے یہاں تجلی فرمائی تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

۱۳۔ فرعون (Pharoah) مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔ اور جس فرعون سے حضرت موسیٰ کو سابقہ پیش آیا تھا وہ تقریباً ۱۴۰۰ قبل مسیح مصر میں حکمراں تھا۔ فرعون کی سرکشی یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا بندہ سمجھنے کے بجائے آزاد اور خود مختار سمجھتا تھا۔ اور اپنے ربِ اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ نیز حکومت و فرمانروائی کے سارے کام اللہ سے کفر اور اس سے بغاوت کی بنیاد پر انجام دیتا تھا۔ اس نے اپنی خودسری کی بنا پر بندگانِ خدا کے ساتھ ظلم و جور کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت کی مسلم قوم ''بنی اسرائیل'' پر سخت ظلم ڈھا رہا تھا۔

۱۴۔ پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب اسلام قبول کرنا ہے، جو انسان کو کفر و شرک کی گندگیوں سے پاک کرتا اور ایمان اور حُسنِ عمل سے سنوارتا ہے۔

۱۵۔ عقائد و اعمال کی پاکیزگی کا انحصار خدا خوفی پر ہے۔ اور خدا خوفی اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب انسان کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے۔ ''رب کی راہ دکھاؤں'' سے اشارہ اسی معرفتِ الٰہی (خدا کی پہچان) کی طرف ہے۔

فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾	۲۰ پھر (موسیٰ نے) اس کو بڑی نشانی دکھائی۔۱۶؎
فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾	۲۱ مگر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا۔
ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾	۲۲ پھر پلٹا اور مخالفت میں سرگرم ہو گیا۔۱۷؎
فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾	۲۳ اور لوگوں کو جمع کر کے اعلان کیا۔
فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾	۲۴ اور کہا، میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب۔۱۸؎
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾	۲۵ بالآخر اللہ نے اُسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾	۲۶ بے شک اس میں بڑی عبرت ہے، ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے۔۱۹؎
ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾	۲۷ کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ دشوار ہے یا آسمان کی؟ اس نے اس کو بنایا۔۲۰؎
رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾	۲۸ اس کی چھت بلند کی ۲۱؎، اور اس کو درست اور ہموار کیا، ۲۲؎
وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾	۲۹ اس کی رات ڈھانک دی اور اس کا دن نکالا۔ ۲۳؎
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾	۳۰ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ ۲۴؎
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾	۳۱ اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾	۳۲ اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے،
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾	۳۳ تاکہ تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی زندگی کا سامان ہو۔۲۵؎
فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾	۳۴ پھر جب وہ عظیم ہنگامہ برپا ہوگا۔۲۶؎
يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾	۳۵ جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا، ۲۷؎
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾	۳۶ اور دوزخ ہر دیکھنے والے کیلئے بے نقاب کر دی جائے گی۔
فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾	۳۷ تو جس نے سرکشی کی ہوگی، ۲۸؎
وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾	۳۸ اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہوگی، ۲۹؎
فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾	۳۹ دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾	۴۰ البتہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا ہوگا ۳۰؎ اور اپنے نفس کو بری خواہشات سے روکا ہوگا،

۱۶؎ بڑی نشانی سے مراد لاٹھی کے سانپ بن جانے کا معجزہ ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ اور جو اس بات کی واضح علامت تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

۱۷؎ تا کہ لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائیں اور ان کی دعوت قبول نہ کریں۔

۱۸؎ قدیم زمانہ کے بادشاہ صرف حکومت ہی کے دعویدار نہیں ہوتے تھے، بلکہ رعایا سے اپنی پوجا بھی کراتے تھے۔ تا کہ لوگوں کو ان کے ساتھ گرویدگی ہو، ان کی حکومت مضبوط ہو، اور وہ پوری ''شانِ خدائی'' کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ اپنے اس تقدس کو منوانے کے لئے وہ اپنا رشتہ ستاروں اور دیوی دیوتاؤں سے بھی جوڑتے تھے۔ اور ان کے اوتار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ فرعون بھی اپنی پرستش لوگوں سے کراتا تھا۔ اور اس مفہوم میں اپنے رب اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ اس وقت مصر میں بت پرستی رائج تھی۔ اور فرعون نے اپنے علاوہ کسی بت کی پرستش کو قانوناً ممنوع نہیں ٹھہرایا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا اپنی اُلوہیت اور اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ، موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید کے مقابلہ میں تھا۔ وہ دوسرے خداؤں کی جو نفی کرتا تھا وہ محض موسیٰ علیہ السلام کو زچ کرنے کیلئے تھی۔

فرعون کے اس دعوے کا مطلب یہ لینا صحیح نہ ہوگا، کہ وہ خالقِ کائنات ہونے کا مدعی تھا۔ کیوں کہ یہ دعویٰ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب لینا بھی صحیح نہ ہوگا کہ وہ سیاسی معنیٰ میں اپنے آپ کو الٰہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔ اگر فرعون کا یہ دعویٰ محض سیاسی معنیٰ میں ہوتا، تو وہ لوگوں سے یہ نہ کہتا کہ ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ'' (مجھے اندیشہ ہے کہ موسیٰ تمہارا دین بدل نہ ڈالیں۔ المؤمن: ۲۶) کیونکہ محض سیاسی حاکمیت کا دعویٰ کرنے والے شخص کو اس سے کیا مطلب کہ لوگوں کا مذہب برقرار رہتا ہے یا تبدیل ہو جاتا ہے؟ اسی طرح فرعون حضرت موسیٰ سے یہ بھی نہ کہتا کہ اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَیۡہِ اٰبَآءَنَا (کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے آبائی مذہب سے ہٹا دے؟ یونس: ۷۸)

۱۹؎ یعنی جن لوگوں کے اندر خدا کا کچھ خوف ہے ان کیلئے اس واقعہ میں بڑا سبق ہے۔ سبق اس بات کا کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ اللہ اپنے قانون عدل کے ساتھ اس پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ فرعون جیسے جابر اور پرشکوہ بادشاہ پر بھی اس کا تازیانہ عبرت برسا ہے۔ اس لئے نافرمانوں کو اس دنیا میں بظاہر جو ڈھیل ملتی ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ انسان کو اللہ کے حضور، اپنے طرزِ عمل کے سلسلہ میں جوابدہی کرنا نہیں ہے۔ اور نہ ہی قانون مکافاتِ عمل کی کوئی حقیقت ہے۔

۲۰؎ یعنی آسمان کی تخلیق جو بے شمار ستاروں، محیر العقول کہکشاؤں، عظیم الشان سیاروں اور زبردست نظام شمسی پر مشتمل ہے۔ اور جن کے درمیان کمال درجہ کا نظم پایا جاتا ہے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے اس عظیم الشان عالم کی تخلیق آسان ہوئی۔ تو پھر انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کیوں مشکل ہو؟ کیا اتنی واضح بات بھی تمہاری عقل میں نہیں سماتی؟

۲۱؎ آسمان کی بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض ستارے، اتنی دوری پر ہیں کہ ان کی روشنی زمین پر پہنچنے میں کئی نوری سال لگ جاتے ہیں۔

۲۲؎ یعنی آسمان کا صرف مادہ پیدا کر کے نہیں چھوڑا، بلکہ اس کا مادہ پیدا کرنے کے بعد اس سے ایک عظیم الشان کائنات تشکیل دی، اسے باہم مربوط کیا، اور ایسا آراستہ کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا ایک سجی سجائی اور پر رونق بزم ہے، جو ہر دیکھنے والے کو غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔

۲۳؎ دن اور رات کو آسمان کی طرف منسوب کرنا، اس اعتبار سے ہے کہ انسان کو رات اور دن کے آثار آسمان پر ظاہر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

۲۴؎ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے آسمان کو پیدا کیا اور اس کے بعد زمین کو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آسمان کے علاوہ زمین کو بھی پیدا کیا اور اسے بچھایا۔ آسمان کے کمالات اور زمین کی نعمتیں دونوں لائقِ غور ہیں۔

۲۵؎ زمین کا یہ مربّیانہ اور حکیمانہ نظام ایک عظیم منصوبہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور قرآن اس منصوبہ کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ حیات بعد الموت اور جزائے عمل ہے۔

۲۶؎ یعنی قیامت، جو اس کائنات کا سب سے بڑا ہنگامہ ہے۔

۲۷؎ انسان جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے وہ سب اس کے ذہن کے پردوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی زندگی کے گذشتہ سالہا سال کے واقعات اپنے حافظہ کی مدد سے یاد کرتا ہے۔ یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے اعمال کا ریکارڈ خود انسان کا ذہن تیار کر رہا ہے۔ قیامت کے دن اس کا حافظہ اتنا تیز ہوگا کہ اس کے اعمال کے سارے نقوش اس کے ذہن پر اُبھر آئیں گے۔

۲۸؎ یعنی خدا کا وفادار بندہ بن کر رہنے کے بجائے، کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کیا ہوگا۔ اوپر فرعون کی سرکشی کی مثال گذر چکی۔

۲۹؎ یعنی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو مقصود بنایا ہوگا اور اس کے مفاد کو مقدم رکھا ہوگا۔

۳۰؎ یعنی جو دنیا میں اس تصور سے کانپتے رہے کہ اللہ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ ظاہر ہے جس کے اندر جوابدہی کا یہ تصور ہوگا، وہ اللہ کے وفادار بندے ہی کی حیثیت سے زندگی گذارے گا۔

اُسے (قیامت کو) جس روز وہ اسے دیکھ لیں گے، تو
انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ وہ (دنیا میں) ایک شام یا
ایک صبح سے زیادہ نہیں ٹھہرے تھے۔ (القرآن)

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾

۴۱ جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾

۴۲ (اے نبی!) یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ گھڑی کب آ ٹھہرے گی؟

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾

۴۳ اس کا وقت بتانے سے تمہیں کیا واسطہ! ۳۱؎

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾

۴۴ اس کا علم تو تمہارے رب ہی کو ہے۔

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾

۴۵ تمہارا کام صرف ان لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو اس سے ڈریں۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾

۴۶ جس روز وہ اسے دیکھ لیں گے، تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ وہ (دنیا میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں ٹھہرے تھے۔ ۳۲؎

۳۱؎ یعنی رسول کو قیامت کا وقت بتانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے، بلکہ اسے متنبہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ قیامت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی۔ جس طرح موت اپنے وقت پر آ کر رہتی ہے۔ گو انسان کو اس کا وقت پہلے سے معلوم نہیں ہوتا۔

۳۲؎ یعنی اس وقت وہ قیامت کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ لیکن جب وہ آئے گی تو انہیں محسوس ہوگا کہ بہت جلد آ گئی۔ اور انہیں دنیا میں جو مہلت ملی تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ وقت ایک اضافی چیز ہے۔ گھنٹوں کے مقابلہ میں منٹ وقت کا نہایت قلیل حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح دنوں کے مقابلہ میں گھنٹے اور مہینوں اور سالوں کے مقابلہ میں دن۔ قیامت کے دن جب زمان و مکان بدل جائیں گے۔ اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا۔ تو جو وقت انسان نے دنیا میں گذارا تھا، وہ اسے وہاں کے زمان کی نسبت سے بہت تھوڑا معلوم ہوگا۔ اور اس وقت یہ احساس ابھرے گا کہ کاش اپنے یہ قیمتی لمحات اپنی آخرت بنانے میں صرف کئے ہوتے!

سورۂ عبس

۸۰۔ عبس

نام سورہ کا آغاز لفظ عبس (تیوری چڑھائی) سے ہوا ہے، جو ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام 'عبس' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی، جب اہل مکہ کے سامنے دعوت پیش ہو چکی تھی۔ اور سرداران قریش نے اسے رد کر دیا تھا۔

مرکزی مضمون اِنذار یعنی جزا کے دن سے انسان کو خبردار کرنا ہے، تاکہ وہ عقیدہ و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرے۔ سابق سورہ کے ساتھ اس کی مناسبت بالکل ظاہر ہے۔ اس کے اخیر میں یہ فرمایا گیا تھا کہ تم ان ہی لوگوں کو قیامت سے خبردار کر سکتے ہو، جو اس سے ڈرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس سورہ میں واضح کیا گیا ہے کہ، جو لوگ قیامت کا انکار کرنے پر مصر ہوں اور انہیں اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہ ہو، ان کے پیچھے جوشِ تبلیغ میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۱۰ میں ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ کبر و غرور اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں، ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ دیں، جو طالبِ حق ہیں اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

آیت ۱۱ تا ۱۶ میں قرآن کی عظمت و رفعت بیان کی گئی ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ جس چیز کو قبول کرنے کی دعوت نبی ﷺ دے رہے ہیں وہ کتنے بلند مرتبہ کی چیز ہے۔ لہٰذا جو اس کی ناقدری کریں گے وہ اپنے ہی کو بہت بڑے خیر سے محروم رکھیں گے۔ اس باعظمت کلام کو پیش کرنے کے لئے پروقار طریقہ ہی اختیار کیا جانا چاہئے۔

آیت ۱۷ تا ۳۲ میں قیامت کا انکار کرنے والوں کو تنبیہ، اور انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے پر اللہ کی ربوبیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

آیت ۳۳ تا ۴۲ میں قیامت کی ہولناکی کی تصویر پیش کرتے ہوئے نیک کردار اور بدکردار لوگوں کا الگ الگ انجام بیان کیا گیا ہے۔

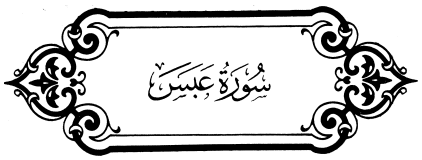

سُوْرَةُ عَبَسَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ﴿١﴾

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿٢﴾

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ﴿٣﴾

اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿٤﴾

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ﴿٥﴾

فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿٦﴾

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿٧﴾

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ﴿٨﴾

وَهُوَ يَخْشٰى ۙ﴿٩﴾

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿١٠﴾

كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿١٣﴾

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ﴿١٤﴾

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ﴿١٥﴾

كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾

٨٠۔ سُوْرَۃُ عَبَسَ

آیات: ۴۲

اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے

١ تیوری چڑھائی ۱؎، اور منہ پھیرلیا،

٢ اس بات پر کہ اس کے پاس نابینا آیا۔ ۲؎

٣ (اے پیغمبر!) تمہیں کیا معلوم شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا،

۴ یا نصیحت پر دھیان دیتا، اور نصیحت اس کے حق میں مفید ہوتی۔

۵ جو شخص بے پرواہی برتتا ہے،

٦ اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔

٧ حالانکہ اس کے اصلاح قبول نہ کرنے کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

٨ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے،

٩ اور وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے،

١٠ اس سے تم بے پرواہی برتتے ہو۔ ۳؎

١١ ہرگز نہیں ۴؎۔ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ ۵؎

١٢ تو جو چاہے اسے قبول کرے۔

١٣ یہ ایسے صحیفوں (اوراق) میں ہے، جو نہایت قابل احترام ہیں، ٦؎

١۴ بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں، ٧؎

١۵ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں، ٨؎

١٦ جو معزز اور وفا شعار ہیں۔ ٩؎

۱۔ تیوری چڑھانے کا فعل، جیسا کہ آگے کے مضمون سے واضح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوا تھا۔لیکن یہاں مخاطب کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔متنبہ کرنے کا یہ حکیمانہ انداز ہے۔

۲۔ مراد عبداللہ ابن اُم مکتومؓ ہیں جو نابینا تھے۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی اور نبی ﷺ کے برادر نسبتی تھے۔

نبی ﷺ نے انہیں حقیر جان کر تیوری نہیں چڑھائی تھی۔ کیوں کہ آپ غریبوں، ناداروں اور معذوروں کی سب سے زیادہ قدر فرمانے والے تھے۔ بلکہ ان کا آنا اس بنا پر آپ کو ناگوار ہوا تھا کہ آپ کی مجلس میں اس وقت قریش کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، جن کے سامنے آپ بڑے انہماک کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے۔اس موقع پر عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کی طرف توجہ کرنے سے سرداران قریش کی طرف التفات میں کمی ہوتی، اس لئے آپ نے سردارانِ قریش سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔اور عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ نبی ﷺ سے یہ چوک کسی غلط جذبہ کے تحت نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ جوشِ دعوت میں ہوئی تھی۔لیکن چونکہ یہ ایک ناپسندیدہ بات تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت فرمائی۔

۳۔ ان آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ نبی ﷺ کی مجلس میں ابوجہل، امیہ بن خلف، عتبہ وغیرہ سردارانِ قریش موجود تھے، جنہیں آپ قبولِ اسلام کی دعوت دے رہے تھے اس اثناء میں ابن ام مکتومؓ جو نابینا تھے تشریف لائے۔وہ اپنی اصلاح کی غرض سے اور نصیحت سننے کی طلب میں تشریف لائے تھے۔ان کی طرف توجہ کرنے کے بجائے آپ سردارانِ قریش ہی کی طرف متوجہ رہے، جو نصیحت پر کان دھرنے کیلئے آمادہ نہیں تھے۔ یہ بات شانِ نبوت اور وقارِ دعوت کے خلاف تھی۔اس لئے اس پر تنبیہ نازل ہوئی۔اس تنبیہ کا رخ بظاہر نبی ﷺ کی طرف ہے۔لیکن اصل میں اس کی زد منکرینِ دعوت پر پڑ رہی ہے۔اور مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ، جن لوگوں پر دعوتِ حق واضح ہو چکی اور وہ دیدہ و دانستہ انکار پر مصر ہیں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔اور اپنی توجہ ان بندگانِ خدا کی طرف مبذول کرو جو ہدایت کے طالب اور قرآن کے قدرداں ہیں۔اور چاہتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں پاکیزگی آجائے۔دوسری طرف منکرین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری اصلاح کے سلسلہ میں پیغمبر کے اس اضطراب اور انتھک کوشش کے باوجود، اگر تم اس پر کان دھرنے کیلئے آمادہ نہیں ہو تو جس کتاب کی طرف تمہیں دعوت دی جا رہی ہے اس کی وقعت اس سے کم ہونے والی نہیں۔ بلکہ تم خود ہی بے وقعت ہو گے۔یہ کتاب تو نہایت بلند اور عالی مرتبت ہے۔اس کی ناقدری کرنے والوں کے حصہ میں سوائے محرومی کے کچھ نہیں آسکتا۔

۴۔ یعنی ایسے ناقدروں کے پیچھے پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

۵۔ مراد قرآن ہے۔

۶۔ یہاں قرآن کی عظمت بیان کی گئی ہے۔اور واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ جو لوگ اس کلام کی ناقدری کرتے ہیں وہ اپنی ہی قدر گھٹاتے ہیں۔ورنہ اس کی جو قدر و منزلت آسمانوں میں ہے، اس کا اگر انہیں اندازہ ہوتا تو وہ ہرگز ناقدری نہ کرتے۔

۷۔ قرآن شیطان کی دخل اندازیوں سے بالکل پاک ہے۔اس میں باطل کی آمیزش ممکن ہی نہیں، کیوں کہ شیاطین کی رسائی اس کتاب تک ہو ہی نہیں سکتی۔انہیں اس سے بہت دور رکھا گیا ہے۔لہٰذا قرآن از اوّل تا آخر خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل اور ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہے۔

۸۔ مراد فرشتے ہیں جو قرآن کو لکھ رہے تھے۔

۹۔ یہ ان فرشتوں کی صفات ہیں جو قرآن کو آسمان پر لکھ رہے تھے۔اور اسے بحفاظت نبی ﷺ تک پہنچا رہے تھے۔اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ قرآن جن فرشتوں کے ذریعہ حضرت محمد ﷺ تک پہنچایا جا رہا ہے، وہ ایسے ذی شان بلند پایہ اور امانتدار ہیں کہ ان سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں۔اور نہ وہ شیطان کو کسی قسم کی مداخلت کا موقع دے سکتے ہیں۔اسلئے اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں کہ وہ اس خدائی امانت کو جوں کا توں نبی ﷺ تک پہنچا رہے ہیں۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾	۱۷ غارت ہو ۱۰ے، انسان کیسا ناشکرا ہے!
مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾	۱۸ اسے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا؟ ۱۱ے
مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾	۱۹ ایک بوند سے۔ پیدا کیا اور اس کی منصوبہ بندی کی، ۱۲ے
ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾	۲۰ پھر اس کے لئے راہ آسان کر دی، ۱۳ے
ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾	۲۱ پھر اس کو موت دی ۱۴ے، اور قبر میں دفن کرایا، ۱۵ے
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾	۲۲ پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۶ے
كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾	۲۳ ہرگز نہیں۔ اس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی ۱۷ے، جو اللہ نے اُسے دیا تھا۔
فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾	۲۴ انسان ذرا اپنی غذا کو دیکھے، ۱۸ے
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾	۲۵ کہ ہم نے خوب پانی برسایا، ۱۹ے
ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾	۲۶ پھر زمین کو اچھی طرح پھاڑا، ۲۰ے
فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾	۲۷ پھر اس میں اُگائے غلے،
وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾	۲۸ اور انگور اور ترکاریاں،
وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾	۲۹ اور زیتون اور کھجور،
وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾	۳۰ اور گھنے باغ،
وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾	۳۱ اور میوے اور چارہ،
مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾	۳۲ تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی منفعت کے لئے۔ ۲۱ے
فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾	۳۳ پھر جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز گرجے گی، ۲۲ے
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾	۳۴ اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے،
وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾	۳۵ اپنی ماں اور اپنے باپ سے،
وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾	۳۶ اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔

۱۰۔ یہاں سے کلام کا رخ کفار کی طرف پھرتا ہے۔

۱۱۔ یعنی انسان اپنی حقیقت پر غور کرے کہ اس کی زندگی کا آغاز پانی کے ایک حقیر قطرے سے ہوا۔ پھر اس میں یہ گھمنڈ کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگے، اور اس کے اس احسان کو کہ اسے ایک بہترین مخلوق کی حیثیت دی، فراموش کر دے۔

یہاں قیامت کے دن انسان کے اٹھائے جانے پر بھی استدلال ہے۔ یعنی جس ہستی کی کرشمہ سازیوں کا یہ حال ہو کہ وہ پانی کی ایک حقیر بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق کو اٹھا کھڑا کر سکتی ہے، اس کے لئے آخر یہ کیوں ناممکن سمجھا جائے کہ وہ قیامت کے دن اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گی؟

۱۲۔ یعنی ہر انسان کی تخلیق ایک منصوبہ کے ساتھ ہوئی ہے۔ مثلاً اس کی شکل وصورت، جسامت، ذہنی صلاحیت، کام کرنے کی استعداد، قوت و طاقت، مقامِ پیدائش اور موت کا وقت وغیرہ۔ اس خدائی منصوبہ کے مطابق ہی انسان زندگی گذارتا ہے، اور اس سے آزاد ہونا اس کے لئے ناممکن ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی تخلیق کی ایک غایت ہے۔

۱۳۔ مراد زندگی کی راہ ہے جس کے نشیب وفراز کو انسان بآسانی طے کرتا ہے۔ اس کے وجود کو برقرار رکھنے اور اس کی نشوونما کیلئے جن جن وسائل کی ضرورت تھی، سب مہیا کر دیئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر بچہ جبلی طور پر ماں کی چھاتیوں کو چوستا ہے اور اس کیلئے غذا کی فراہمی آسان ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عملِ تنفس ایک مشکل کام ہے، لیکن انسان مرتے دم تک اس طرح تسلسل کے ساتھ سانس لیتا اور خارج کرتا رہتا ہے، کہ اسے ذرا بھی تکان لاحق نہیں ہوتی۔

۱۴۔ یعنی موت ہر شخص کے لئے مقدر ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔ اور جب انسان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی موت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ٹال نہیں سکتا، تو پھر وہ کس بل بوتے پر اپنے خالق سے کفر کرتا ہے؟

۱۵۔ معلوم ہوا کہ مُردوں کو قبر میں دفن کرنا طریقۂ فطرت ہے، بخلاف جلانے کے، کہ یہ طریقہ نہ الہامی ہے اور نہ مطابق شرع۔ اسلام چونکہ مہد سے لیکر لحد تک کا دین ہے۔ اس لئے اس نے جہاں جینے کا صحیح طریقہ بتلایا ہے، وہاں مرنے کا بھی صحیح طریقہ بتلایا ہے۔

۱۶۔ یعنی انسان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ یہ کام اس کیلئے نہ مشکل ہے اور نہ اس کی مشیت میں کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے۔

۱۷۔ حکم سے مراد وہ تمام احکام ہیں، جو انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں۔ مثلاً ایک خدا کی پرستش کرنا، سچ بولنا، انصاف کرنا، ظلم نہ کرنا وغیرہ۔ اور وہ احکام بھی جو اس نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ نازل فرمائے۔

۱۸۔ یعنی زندگی بعد موت پر دلائل بہ کثرت ہیں۔ انسان جس غذا سے روزانہ فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے معمولی خیال کرتا ہے، ذرا اسی پر غور کر کے دیکھے کہ وہ پیدا کیسے ہوتی ہے؟ اگر اللہ اسے پیدا نہ کرتا تو انسان کو غذا کہاں سے میسر آتی؟ اس کی پرورش کا یہ سامان اور ربوبیت کا یہ اہتمام اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان سے ان نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہو، کہ اس نے اپنے رب کی ان نعمتوں کو پا کر اس کی شکر گذاری کا طریقہ اختیار کیا یا ناشکری کی۔

۱۹۔ بارش کا کوئی الگ دیوتا نہیں ہے، بلکہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے، جس سے انسان کو پینے کے لئے بھی پانی میسر آتا ہے اور زمین کی روئیدگی کا بھی سامان ہوتا ہے۔ اگر وہ بارش کا انتظام نہ کرتا تو کیا انسان کے لئے زندہ رہنا ممکن ہوتا؟

۲۰۔ ''یہ اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت ہے کہ وہ مینہ برساتا اور زمین کو پھاڑ کر، اس کے اندر سے کونپلیں نکالتا اور نباتات اگاتا ہے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے یہ کہنے کی جسارت کس طرح کرتے ہو کہ وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ قیامت کے دن زمین کو پھاڑ کر مُردوں کو جلا اٹھائے۔

۲۱۔ یعنی کیا یہ نعمتیں جن سے تم رات دن فائدہ اٹھاتے ہو اپنے ساتھ ذمہ داری کا کوئی تصور نہیں لاتیں؟ جس خدا نے تم پر یہ احسانات کئے ہیں کیا وہ تم سے باز پرس نہیں کرے گا، کہ تم اس کے شکر گذار بندے بن کر رہے یا کفرانِ نعمت کیا؟

۲۲۔ مراد قیامت کی ہولناک آواز ہے۔ جب آخری صور پھونکا جائے گا، تو اس کی ہولناک آواز تمام مرے ہوئے انسانوں کو اٹھا کھڑا کرے گی۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ ﴿٣٧﴾

۳۷ اس روز ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ ۲۳؎

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾

۳۸ کتنے ہی چہرے اس روز روشن ہوں گے، ۲۴؎

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾

۳۹ خنداں و شاداں۔ ۲۵؎

وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾

۴۰ اور کتنے ہی چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے،

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾

۴۱ ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔ ۲۶؎

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

۴۲ یہ ہوں گے وہی کافر اور فاجر لوگ۔

۲۳؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دنیا میں انسان اپنے قریبی عزیزوں کی خاطر قبولِ حق سے گریز کرتا ہے۔لیکن قیامت کے دن کی مصیبت ایسی ہوگی کہ نہ یہ ان کے کام آسکے گا، اور نہ وہ اس کے کام آسکیں گے۔ ہر شخص کو اپنی نجات کی فکر لگی ہوگی اور کسی کو ہوش نہ ہوگا۔

۲۴؎ یہ مخلص مؤمنین کے چہرے ہونگے جو ایمان کی روشنی سے دمک رہے ہوں گے۔

۲۵؎ خوشی اس بات کی کہ وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ چہروں کی شگفتگی ان کی نیک روی کا نتیجہ ہوگی اور جنت کا پروانہ پاکر وہ شاداں وفرحاں ہوں گے۔

۲۶؎ یہ کافروں کے چہرے ہوں گے جن پر کفر کی سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ اور ان کی بدعملی ان کے چہروں کو خاک آلود کر رہی ہوگی۔

سورۂ التکویر

۸۱۔ التکویر

نام اس سورہ کی پہلی آیت میں خبر دار کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ لپیٹنے کے لئے لفظ کُوِّرَتْ استعمال ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام التکویر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں لپیٹنے کا ذکر ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو روزِ جزا سے خبردار کرنا ہے۔ اور یہ واضح کرنا ہے کہ پیغمبر اور قرآن اس کی جو خبر دے رہے ہیں وہ ہر قسم کے شبہہ سے بالاتر ہے۔ سابق سورہ میں قیامت کی ہولناکی کا ذکر تھا۔ اس سورہ میں اس کی ہولناکی کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ آدمی قیامت کو اپنے سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ گویا یہ سورہ، قیامت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص روز قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہو وہ سورہ تکویر، سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کو پڑھ لے۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۴ بحوالہ احمد و ترمذی)

نظم کلام آیت ۱ تا ۶ میں قیامت کے پہلے حادثہ (نفخِ اوّل) کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

آیت ۷ تا ۱۴ میں دوسرے حادثہ (نفخِ ثانی) کی۔

آیت ۱۵ تا ۲۵ میں قرآن اور پیغمبرِ قرآن کے بارے میں واضح کیا گیا ہے کہ وہ، جو دعوت پیش کر رہے ہیں اور خبر دے رہے ہیں، وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

آیت ۲۶ تا ۲۹ میں منکرین کو تنبیہ ہے کہ قرآن کی راہ کو چھوڑنا حق و صداقت کی راہ کو چھوڑنا ہے۔ اسلئے وہ سوچیں کہ اس سے انکار کر کے کس گڑھے میں گرنا چاہتے ہیں؟

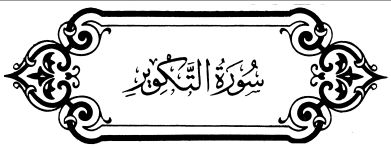

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝٢

وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝٣

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝٤

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝٥

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝٦

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝٧

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝٨

بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝٩

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝١٠

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝١١

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝١٢

وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝١٣

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝١٤

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۝١٥

الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۝١٦

وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۝١٧

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۝١٨

۸۱۔ سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

آیات:۲۹

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، ۱؎

۲ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے، ۲؎

۳ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے، ۳؎

۴ اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی، ۴؎

۵ اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے، ۵؎

۶ اور جب سمندر بھڑکا دئے جائیں گے، ۶؎

۷ اور جب لوگوں کو (مختلف گروہوں میں) بانٹ دیا جائے گا، ۷؎

۸ اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا،

۹ کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی؟ ۸؎

۱۰ اور جب اعمال نامے کھول دئے جائیں گے، ۹؎

۱۱ اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی، ۱۰؎

۱۲ اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی۔

۱۳ اور جب جنت قریب لائی جائے گی، ۱۱؎

۱۴ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائیگا کہ وہ کیا لیکر حاضر ہوا ہے۔ ۱۲؎

۱۵ پس نہیں ۱۳؎، میں قسم کھاتا ہوں ۱۴؎ غروب ہونے والے ۱۵؎،

۱۶ چلنے والے ۱۶؎ اور چھپ جانے والے ۱۷؎ ستاروں کی، ۱۸؎

۱۷ اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو،

۱۸ اور صبح کی جب کہ وہ سانس لے، ۱۹؎

۱۔ سورج کو لپیٹ دئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمانی چراغ جس کی روشنی کروڑ ہا میل تک پھیلی ہوئی ہے، اور جس سے پورا عالم جگمگا رہا ہے قیامت کا دھماکہ ہوتے ہی گل ہو جائے گا۔ اور جب سورج ہی تاریک ہو جائے گا تو یہ دنیا جس عظیم حادثہ سے دوچار ہوگی اس کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔

سورج اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جدید سائنسی اکتشافات کے مطابق زمین کی سطح سورج سے طاقت کی جو مقدار حاصل کرتی ہے، چار ملین ہارس پاور فی مربع میل ہے۔ گویا سورج زمین کے لئے پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن یہ خبر دیتا ہے کہ ایک روز آئے گا جب کہ سورج اپنی یہ عظیم طاقت کھو چکا ہوگا۔ اور وہ قیامت کا دن ہوگا۔ یہ خبر خود اللہ دے رہا ہے، جو سورج سمیت پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ تو یقین کرنے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے۔ تاہم جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، وہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ سورج کو بالآخر تاریک ہونا ہے۔

" And eventually, the sun will become a black dwarf, a very dense, nonluminous object of degenerate matter. "(The New Encyclopedia Britanica Vol. 17 P. 808)

ایک زمانہ میں انسان سورج کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتا رہا ہے۔ اور آج بھی جدید سائنسی اکتشافات کے باوجود سورج کے پرستاروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا بیان یہ ہے کہ سورج خدا نہیں، بلکہ خدا کی پیدا کردہ کائنات کا ایک جز اور اس کا محکوم ہے۔ اور اسی وقت تک روشنی دیتا رہے گا، جب تک اللہ کا وہ حکم نہیں آجاتا جو کائنات کی بساط کو الٹ کر رکھ دے گا۔ جس دن وہ حکم آجائے گا سورج اپنی تمام توانائی کھو دے گا، اور اس کی روشنی بالکل ختم ہو جائے گی۔

۲۔ آفتاب عالمتاب اور جگمگاتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر انسان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ دنیا سدا بہار ہے۔ اور اس کی رونق کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ لیکن قرآن دوٹوک انداز میں انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ یہ فریبِ خیال ہے۔ حقیقت میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے اور وہ بہت قریب ہے، جب سارے چراغ بجھا دئے جائیں گے۔ اور یہ دنیا تاریکی کی نذر ہو جائے گی، تاکہ توڑ پھوڑ کے اس عمل سے ایک نیا عالم وجود میں لایا جا سکے، جس میں نتائجِ عمل کا ظہور ہو۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا جھٹکا لگتے ہی زمین اپنی کشش کھو دے گی۔ اس سے جو ہولناک کیفیت پیدا ہوگی اس کا ہلکا سا تصور ہی انسان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے پہاڑوں کے اڑائے جانے کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔

۴۔ قرآن جس دور اور ماحول میں نازل ہوا، اس میں دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں جو جننے کے قریب ہوتی تھیں، سب سے زیادہ قیمتی چیز خیال کی جاتی تھی اور اہل عرب کی نظر میں یہ محبوب مال تھا۔ اس محبوب مال کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ہے۔ مقصود اس سے یہ واضح کرنا ہے کہ قیامت کا دھماکہ ہوتے ہی انسان اپنے عزیز ترین مال کو بھول جائے گا۔ دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں جو آج اس کے مالک کے نزدیک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اس طرح بے قیمت ہو کر آوارہ پھرنے لگیں گی کہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔ کیوں کہ قیامت کا آغاز ہوتے ہی انسان کو کسی بھی چیز کا ہوش نہیں رہے گا۔

واضح رہے کہ اونٹنی کا یہ ذکر اس وقت کی عربوں کی معیشت کے پیش نظر گویا، ان کے قیمتی سرمایہ پر انگلی رکھ کر اس کے بے وقعت ہو جانے کو ظاہر کرنے کے مترادف تھا، جس نے کلام میں زبردست تاثیر پیدا کر دی۔ اس مثال سے اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قیامت کا بگل بجتے ہی، مال و دولت کے یہ ڈھیر جس کے حصول کو انسان اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہے۔ اور اس بنا پر حقیقی مقصدِ زندگی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، سب بیکار اور فنا ہو جائیں گے۔ خواہ وہ محبوب اونٹنی کی شکل میں ہوں یا قیمتی کاروں، بڑے بڑے کارخانوں اور شاندار عمارتوں کی شکل میں۔

۵۔ یعنی قیامت کا ظہور ہوتے ہی ایسی خوفناک صورت پیدا ہوگی کہ انسان تو انسان، وحشی جانوروں پر بھی سراسیمگی کی حالت طاری ہوگی۔ اور وہ جنگلوں سے بھاگ کر دوسرے جانوروں اور انسانوں کے ساتھ اکٹھا ہونے لگیں گے۔

۶۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ سمندر میں آگ لگ جائے گی۔ لیکن قیامت کا حادثہ بذات خود عجیب تر ہے۔ اس کا پہلا جھٹکا ہی تمام عجیب باتوں کو ختم کر کے رکھ دے گا۔ کیوں کہ قیامت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات کی ساخت میں زبردست تبدیلی ہوگی اور عظیم انقلاب رونما ہوگا۔ ویسے بھی پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں سے مرکب ہے۔ اور اللہ کا ایک اشارہ اس کی اس کیمیاوی ترکیب کو جدا کرنے کے لئے کافی ہے، جس کے نتیجہ میں یہ گیسیں بھڑکنے اور بھڑکانے کا کام کر سکتی ہیں۔

قرآن کے بیان کے مطابق حشر کے لئے زمین کو چٹیل میدان کی شکل دی جائے گی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمندروں کو پاٹ دیا گیا ہوگا اور اس سے پہلے اس کے پانی کو بھڑکا کر ختم کر دیا گیا ہوگا۔

۷۔ یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلہ کا ذکر شروع ہوتا ہے جب تمام انسانوں کو جسم سمیت دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

گروہوں میں تقسیم کرنے سے مراد عقائد و اعمال کی بنیاد پر لوگوں کی گروہ بندی اور درجہ بندی ہے۔ دنیا میں تو مؤمن و کافر، مسلم و مجرم، نیک و بد اور ظالم و مظلوم سب مخلوط رہتے ہیں۔ لیکن قیامت کا جھٹکا لگتے ہی انسانی سوسائٹی کا موجودہ ڈھانچہ چکنا چور ہو جائے گا۔ اور میدان حشر میں ایمان و اخلاق کی بنیاد پر لوگوں کے الگ الگ گروہ بنائے جائیں گے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سورہ واقعہ آیت ۷ تا ۴۴)

۸۔ زندہ درگور کرنے کا طریقہ عربوں کے بعض قبائل میں رائج تھا۔ اس کا ایک سبب تو فقر کا اندیشہ ہوتا اور معاشی خستہ حالی کے پیش نظر وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کھانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس لئے تحدید نسل اور فیملی پلاننگ (Family planing) کا جاہلانہ اور ظالمانہ طریقہ انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ بچوں کے پیدا ہوتے ہی ان کو دفن کر دینے کا تھا۔ اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے عار سمجھتے تھے۔ اور جھوٹی غیرت انہیں اس قبیح اور سنگدلانہ حرکت پر آمادہ کرتی تھی۔ قرآن نے ان کی اس حرکت پر سخت گرفت کی اور بتلایا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں، اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا۔

زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے یہ سوال کہ وہ کس جرم میں ماری گئی، اس کے بے گناہ مارے جانے اور مارنے والے کے جرم کی سنگینی پر دلالت کرتی ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کا یہ بیان اصلاح کے معاملہ میں اس قدر موثر ثابت ہوا کہ اس ظالمانہ رواج کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔

۹۔ دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا، اور خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے، افکار و نظریات سے ہو یا تحریک وجد و جہد سے، قول ہو یا فعل، تقریر ہو یا تحریر حتیٰ کہ حرکات و سکنات اور چال ڈھال کا بھی ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ ریکارڈ دنیا میں خفیہ طریقے پر اللہ کے فرشتے تیار کر رہے ہوتے ہیں، جو ہر فرد کے ساتھ الگ الگ لگے ہوتے ہیں۔ اس ریکارڈ کو قرآن کی زبان میں ''صحیفہ'' یا ''کتاب'' اور اردو میں ''نامۂ اعمال'' کہا جاتا ہے۔ انسان کے مرنے پر یہ ریکارڈ تہہ کر کے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں پیشی کے موقع پر اس کو کھول کر ہر شخص کے سامنے رکھا جائے گا، تاکہ وہ اپنا ریکارڈ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

آدمی کا زندگی بھر کا ریکارڈ ایک ورق (Sheet) کی شکل میں پیش کیا جانا نزول قرآن کے دور میں عام انسان کے لئے حیرت انگیز بات تھی۔ لیکن سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں، جب کہ کتابوں کی مائیکرو فلمیں (Micro Films) تیار کی جانے لگی ہیں، کچھ بھی حیرت کی بات نہیں رہی۔

۱۰؎ مراد آسمان سے اوپر کی دنیا کا بے نقاب کیا جانا ہے۔ آج تو ہماری نگاہیں نیلگوں آسمان تک جا کر رک جاتی ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ہم اس دنیا کا بھی مشاہدہ کر سکیں گے، جو آسمان سے اوپر ہے۔ اور ان غیبی حقائق کو بھی دیکھ سکیں گے، جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ لیکن ان کی خبر قرآن دے رہا ہے۔ اس روز انسان کو خدا کی خدائی اور کائنات کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ آج انسان دنیا کے جس خول میں بند ہے اسی خول کو پوری کائنات سمجھ بیٹھا ہے۔ اور اس سے آگے جن حقائق کی اسے خبر دی جا رہی ہے اس کو وہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ جس طرح مرغی کا بچہ جب تک انڈے کے خول کے اندر بند رہتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ دنیا ہے۔

۱۱؎ قیامت کے دن زمان و مکان کے پیمانے بالکل بدل چکے ہوں گے۔ اس روز انسان جان لے گا کہ جنت میدان حشر سے بہت قریب ہے۔ اور جو لوگ اس کے اہل قرار پائیں گے ان کو اس تک پہنچنے کے لئے نہ انتظار کرنا پڑے گا اور نہ طویل مسافت کی مشقت برداشت کرنا ہوگی۔ بلکہ وہ خود آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرے گی۔ اس کی تفصیلی نوعیت قیامت کے دن ہی واضح ہو سکے گی۔ آج ہم محدود علم کی بنا پر اسے سمجھ نہیں سکتے۔

۱۲؎ یہ ہے ان آیات کا مرکزی مضمون۔ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت ان تمام ہولناکیوں کے ساتھ رونما ہوگی جو اوپر بیان ہوئے ہیں، تو وہ دن عدالتِ خداوندی میں پیشی کا ہوگا۔ اس روز انسان اپنی زندگی بھر کا کچّا چٹھا لے کر حاضر ہوگا، تاکہ اپنے پروردگار کے حضور جوابدہی کر سکے۔ وہ دن بڑا ہولناک ہوگا اور وہ گھڑی بڑی سخت ہوگی۔ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے　　پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

۱۳؎ یہ منکرین کے اس خیال کی تردید ہے کہ قرآن جو قیامت کی خبر دے رہا ہے کسی دیوانہ کی بڑ یا القائے شیطانی ہے۔

۱۴؎ اس طرح کی جو قسمیں کھائی جاتی ہیں ان کا مطلب ان چیزوں کے تقدس اور عظمت کو بیان کرنا نہیں ہوتا، بلکہ ان کو شہادت اور دلیل کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ عربی کا اسلوبِ کلام ہے جس میں زورِ کلام بھی ہے اور بلاغت بھی۔ غیر عربی داں اس اسلوبِ کلام سے ناآشنا ہونے کی بنا پر ان قسموں کا جو قرآن میں مختلف مقامات پر کھائی گئی ہیں، صحیح محل اور ان کے اشارات و مضمرات سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۱۵؎ متن میں لفظ "**الخُنَّس**" استعمال ہوا ہے جس سے مراد غروب ہونے والے ستارے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ستاروں کی جگمگاہٹ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، بلکہ ان کے غروب ہونے کے پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے ستاروں کے چلتے رہنے کی صفت سے پہلے ان کے غروب ہونے کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۶؎ متن میں لفظ "**الجوارِ**" استعمال ہوا ہے جس سے مراد چلتے رہنے والے ستارے ہیں۔ ستاروں کا چلنا اس معنیٰ میں بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کا عام مشاہدہ یہی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان میں سے کون سے ستارے سیارے ہیں اور کون سے ثوابت۔ اور اپنی اس حقیقت کے اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے جس کا انکشاف جدید سائنس نے کیا ہے کہ ستارے خلا میں متحرک ہیں۔

The stars themselves are moving through space - some at tremendous speeds -- but so vast is our distance from them that their position do not appear to the naked eye to alter,even in a century. (The Marvels & Mysteries of Science - p. 82.)

۱۷؎ متن میں لفظ "**الکُنَّس**" استعمال ہوا ہے جس سے مراد چھپنے والے اور غائب ہو جانے والے ستارے ہیں۔ دن میں ستارے غائب رہتے ہیں نیز چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس مناسبت سے ان کی یہ صفت بیان ہوئی ہے۔

۱۸؎ یہاں ستاروں کی رفتار اور ان کے طلوع و غروب کو اس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے، نہ کہ القائے شیطانی۔ ان کا

مقررہ وقت پر طلوع وغروب اور ان کی رفتار میں باقاعدگی ،اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ قانون الٰہی میں جکڑے ہوئے ہیں ۔اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے ۔کروڑ ہا میل کی بسیط فضاء میں ستاروں کا ایک نامعلوم زمانہ سے معلق رہنا اور ایک حیرت انگیز نظم کا پابند ہو کر رہنا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کائنات کا نظام ایک حکیمانہ نظام ہے۔جس کے پیچھے ایک علیم وخبیر ہستی کا مدبرانہ منصوبہ کارفرما ہے۔قرآن اس منصوبہ کی تشریح کرتا ہے اور خالق کائنات کی جن صفات کی طرف ستاروں کا یہ نظام اشارہ کرتا ہے ان کو وہ کھول کر پیش کرتا ہے۔گویا قرآن کا عکس اس کائنات کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔اور اس کی صداقت کو آثار کائنات کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔

ستارے اور سیارے اپنے حیرت انگیز طبعی کوائف کی بنا پر انسان کو دعوت فکر دیتے ہیں۔لیکن انسان کے غور وفکر کا انداز یہ رہا ہے کہ ان کو وہ متصرف بالذات مان کر ان کی پوجا کرتا اور ان سے شگون لیتا رہا ہے ۔جس کی بناء پر علم جوتش (Astrology) کو فروغ حاصل ہوا۔اور کہانت (Soothsaying) کی گرم بازاری ہوئی۔اس طرح انسان کے بھٹکنے کا سامان ہوتا رہا۔پھر انسان ان کی ساخت اور ان کے فاصلے وغیرہ کے بارے میں معلومات کے ڈھیر لگاتا ہے۔جس کی بنا پر علم فلکیات (Astronomy) کو فروغ ہوا اور سائنس نے خوب ترقی کی۔یہ صورت انسان کے لئے مفید ہوئی تو بس اس کی معلومات میں اضافہ کی حد تک۔اس سے انسان اپنی اور کائنات کی اصل غایت معلوم کرنے کے تعلق سے کوئی رہنمائی حاصل نہ کر سکا۔ قرآن غور وفکر کا جو انداز اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ان کے مشاہدہ سے ان کے خالق کی معرفت (پہچان) حاصل کرے۔کیوں کہ یہ ستارے اپنے خالق کی عظیم الشان صفات کا مظہر ہیں۔جس طرح ایک حسین ترین تصویر کو دیکھ کر اس کے مصور (Artist) کی فنِ تصویر میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، اسی طرح ان درخشاں ستاروں کی صناعی اور ان کے حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر خالق کائنات کی صفت قدرت، صفت ربوبیت، صفت علم، صفت فرمانروائی، صفت عدل، صفت حکمت، اور اس طرح کی دوسری صفات کی ابتدائی معرفت انسان کو حاصل ہو جاتی ہے۔بالفاظ دیگر ستارے اپنے خالق کا جو تعارف اپنی خاموش زبان سے کراتے ہیں، وہ قرآن کے بیان سے جو خالق کائنات کا مکمل اور تفصیلی تعارف پیش کرتا ہے، کامل درجہ ہم آہنگ ہے۔اور یہ اس کی حقانیت کا بیّن ثبوت ہے۔پھر کمال درجہ کے اس حکیمانہ کلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انسانی تصنیف ہے، یا شیطانی وساوس کا نتیجہ ہے۔یا اس بنا پر کہ وہ قیامت کی آمد کی خبر دے رہا ہے، اسے کہانت پر محمول کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کیسی مذموم کوشش اور کتنی بڑی ناانصافی ہے؟

۱۹؎ رات کے رخصت ہونے اور صبح کے نمودار ہونے کا وقت بھی عجائباتِ قدرت میں سے ہے۔اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا رات کی تاریکی کو چیر کر صبح نے جنم لیا ہے۔اور جب نسیم سحر چلتی ہے تو یہ احساس کروٹیں لینے لگتا ہے کہ گویا صبح سانس لے رہی ہے۔یہاں ان کیفیات کو شہادت میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس ہستی نے رات اور دن کے آمد ورفت کا یہ عجیب وغریب نظام قائم کیا ہے، وہ اس نظام کے بطن سے ایک عجیب تر نظامِ نو بھی پیدا کر سکتا ہے۔اور اس کی حکمت اس کی متقاضی ہے کہ ایسا کیا جائے۔اس لئے قرآن قیامت کی آمد اور ایک نئے نظام کی تشکیل ۔۔۔۔۔جس میں جزائے عمل کا معاملہ پیش آئے گا۔۔۔۔کی جو خبر دے رہا ہے وہ خلافِ عقل نہیں بلکہ موجودہ نظام کائنات کا ایک اُبھرتا ہوا تقاضا ہے۔

یہ (قرآن) تو دنیا والوں کے لئے ایک یاددہانی ہے، تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے۔ (القرآن)

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾	۱۹ کہ یقیناً یہ ایک معزز پیغامبر کا (لایا ہوا) کلام ہے، ۲۰؎
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾	۲۰ جو قوت والا ہے ۲۱؎، اور مالکِ عرش کے ہاں بلند مرتبہ ہے۔ ۲۲؎
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾	۲۱ وہاں اس کا حکم مانا جاتا ہے ۲۳؎ اور وہ امانت دار ہے۔ ۲۴؎
وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾	۲۲ اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔ ۲۵؎
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾	۲۳ اس نے اس فرشتہ کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ ۲۶؎
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾	۲۴ اور وہ غیب کی باتیں بتانے کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ ۲۷؎
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾	۲۵ اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے، ۲۸؎
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾	۲۶ پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾	۲۷ یہ تو دنیا والوں کے لئے ایک یاددہانی ہے،
لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾	۲۸ تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے۔ ۲۹؎
وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾	۲۹ اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔ ۳۰؎

۲۰۔ یہ وہ بات ہے جس پر اوپر کی آیات میں استشہاد کیا گیا ہے، یعنی قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر۔ معزز پیغامبر سے مراد جبریل ہیں جو خدا کے معزز فرشتے ہیں۔ وہ خدا کا کلام لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے، اور ٹھیک ٹھیک ان ہی الفاظ میں آپ کو پہنچاتے تھے۔

چونکہ یہ کلام القائے ملکوتی ہوتا تھا نہ کہ القائے شیطانی، اس لئے آیت میں کلام کو خدا کے فرستادہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

۲۱۔ یہ وحی لانے والے فرشتہ جبریل علیہ السلام کی صفت ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس لئے شیاطین ان کے کام میں مخل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پرواز آسمان سے پرے ہے، اور وہ اللہ کا پیغام اس کے رسول تک بحفاظت پہنچانے پر پوری طرح قادر ہیں۔

۲۲۔ یہ حضرت جبریل کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے۔ یعنی ان کی رسائی براہ راست فرمانروائے کائنات تک ہے، اور وہ اس کے حضور مقرب اور عالی مقام ہیں۔

۲۳۔ یعنی جبریل فرشتوں کے سردار ہیں، وہ اس کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ لہٰذا جس کے ماتحت فرشتوں کی فوج ہو اور جس کے اشارہ پر وہ حرکت میں آتے ہوں اس کے کام میں شیطانی قوتوں کے دخل انداز ہونے کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے؟

۲۴۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی صفتِ امانت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کو، جوں کا توں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کی طرف سے کسی کمی وبیشی کا ہرگز احتمال نہیں ہے۔

قرآن کے لانے والے فرشتہ کا یہاں جو تعارف کرایا گیا ہے، اس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ یہ کلام لفظاً لفظاً ارشادِ الٰہی (Word of God) ہے، جس کو نہایت اہتمام کے ساتھ اور نہایت پاکیزہ ذریعہ سے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جا رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۵۔ ساتھی سے مراد نبی ﷺ ہیں اور خطاب اہل مکہ سے ہے، جن کے درمیان آپ نے ساری زندگی بسر کی، اور ایک دانشمند انسان ہی کی حیثیت سے آپ متعارف رہے۔ ایسی شخصیت کو دیوانہ قرار دینا ایک بے تکی بات تھی۔ لیکن منکرینِ قرآن آپ کی مخالفت میں ایسے اندھے ہو گئے تھے کہ اس قسم کی بے تکی باتیں کہتے ہوئے ان کو ذرا تامل نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آپ کے دعوئے رسالت کو دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ان عقلمندوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ آپ کی پیش کردہ کتاب، ایسی حکیمانہ باتوں سے پُر اور ایسی پاکیزہ تعلیمات پر مشتمل ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ پھر کیا کوئی دیوانہ آج تک حکیمانہ باتیں پیش کر سکا ہے یا کسی مجنون نے لوگوں کے اخلاق سنوارے ہیں؟ سچ ہے ۔

ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

۲۶۔ یعنی وحی لانے والے فرشتہ کو اپنی اصل شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے کھلے کنارہ پر دیکھا تھا۔ اس لئے اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو ان کی اصل شکل میں دیکھا تو ان کے چھ سو پَر تھے۔ اور ان کے عظیم وجود سے آسمان وزمین کے درمیان کی فضا بھر گئی تھی۔ (مسلم کتاب الایمان) اس سے ان کی زبردست طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۷۔ یعنی جو وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جا رہی ہے، اس میں ملاءِ اعلیٰ کے حقائق کا بھی انکشاف ہے اور قیامت کی آمد کی خبر بھی۔ ان باتوں سے لوگوں کو باخبر کرنے میں آپ کسی بخل اور تنگی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ بلکہ اپنا فرض منصبی سمجھ کر اسے بے کم وکاست لوگوں تک پہنچانے میں سرگرم ہیں۔ تاکہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنے رب کی ہدایت کو قبول کریں۔

گویا وحی الٰہی کا یہ پورا سلسلہ آسمان سے لے کر زمین تک سِلْسِلَةُ الذَّهَبِ (سونے کی زنجیر) ہے، جس کی کوئی کڑی بھی ناقص نہیں ہے کہ آدمی کے لئے

شبہہ کرنے کی کوئی گنجائش ہو۔

۲۸۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں کہانت کا رواج تھا۔ کاہن (Soothsayers) غیب کی خبریں جاننے کے دعویدار ہوتے۔ اور شیاطینِ جن کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ آسمان میں پرواز کر کے غیب کی خبریں لاتے ہیں۔ جھوٹی خبریں ان پر القاء کرتے اور وہ ان میں مزید جھوٹ ملا کر بیان کرتے۔ وہ چونکہ مستقبل کا حال بیان کرنے کے دعویدار ہوتے تھے۔ اس لئے انہیں لوگوں سے نذرانے وصول کرنے اور اپنی دوکان چمکانے کا خوب موقع ملتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وحی الٰہی اور قیامت کی آمد کی خبر سن کر، منکرینِ قرآن نے آپ پر کہانت کا الزام لگا کر وحی الٰہی کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ القائے شیطانی ہے۔ یہاں ان کے اسی الزام کی تردید کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے شیطان کو اس کلام پاک سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کیا کسی شیطانی کلام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو خدا سے جوڑے۔ اس میں بصیرت کی روشنی پیدا کرے، اس کے اخلاق کو سنوارے، اس کے خیالات میں پاکیزگی پیدا کرے، اس کے کردار کو بلند کرے اور سماج میں بھلائیوں کی پرورش کے لئے اسے آمادہ کرے۔ اگر شیطانی کلام کی یہ خصوصیات ہو سکتی ہیں تو ماننا پڑے گا سب سے بڑا نیک صفت اور مصلح شیطان ہی ہے، جب کہ کوئی بھی شخص اس کا نام اس پر لعنت بھیجے بغیر نہیں لیتا۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر القائے شیطانی کا الزام لگانے والے، بجائے خود القائے شیطانی کا شکار ہیں۔ اس لئے اتنی موٹی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

۲۹۔ یعنی قرآن یاددہانی اور نصیحت تو ہے سارے انسانوں کے لئے۔ لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو راہ راست اختیار کرنا چاہیں، جو طالب حق نہ ہو وہ اس چشمۂ ہدایت سے فیضیاب نہیں ہوسکتا۔

۳۰۔ یعنی گو نصیحت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کے لئے انسان کا چاہنا شرط اوّل ہے۔ لیکن یہ کام توفیقِ الٰہی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔ اللہ کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے، اس لئے انسان اس گھمنڈ میں مبتلا نہ رہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔